بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

علم کی عظمت

جنوری کے وسط میں سرپرست ''المآثر'' حضرت مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ العالی کی معیت میں حرمین شریفین کی زیارت اور عمرہ کی سعادت سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملا، اس شرف وسعادت پر رب کائنات کا جس قدر بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ اس مبارک سفر میں ۹/دن مکہ مکرمہ کے مقدس شہر میں اور ۳/دن سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بابرکت شہر اور فیوض وبرکات کے مرکز میں قیام کا موقع میسر ہوا۔ یہ مدت اس قدر مختصر تھی کہ چشم زدن میں گزر گئی، اور طائر شوق پیاسا ہی رہ گیا، یہ چند دن جس تیزی سے گزرے کہ وقت کی رفتار بڑھ جانے کا گمان ہونے لگا تھا۔

خیر اس وقت اس سفر کی روداد بیان کرنا مقصود نہیں ہے، بس ایک یادگار مجلس کی کچھ سبق آموز باتیں ہیں، جن کو قلم بند کرنے کا قلب میں داعیہ پیدا ہوگیا ہے۔

سعودی عرب کے شہر جدہ میں ایک شامی عالم شیخ ایمن رشدی سوید ہیں۔ اپنے ملک شام سے ہجرت کر کے سعودی عرب میں سکونت اختیار کر لی ہے، شام کی تاریخ بڑی عجیب وغریب ہے، دنیا کا قدیم ترین ملک ہے اور بے شمار تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے، اس کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سرزمین نے جس قدر حوادث اور انقلابات دیکھے ہیں، روئے زمین کے کسی اور حصے میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ماضی قریب میں جب وہاں کے ظالم وجابر فرمانروا حافظ الاسد نے شامی عوام پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھانے شروع کیے، اور علماء کو خاص طور سے اپنے ظلم کا نشانہ بنایا، تو بہت سے اہل علم وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے، ان ہی اہل علم وکمال میں علامۂ شام شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ، شیخ محمد عوامہ

جیسے اساطین علم ہیں، اوران ہی میں ایک فاضل شیخ ایمن سوید ہیں۔

۱۹۸۶ء میں اور پھر ایک سال بعد شیخ ایمن مئو تشریف لائے تھے، اور کئی ہفتے رہ کر حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بخاری شریف پڑھی تھی، مگر جب دو سفر میں بھی کتاب پوری نہیں ہوئی، تو دعوت دے کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو حجاز بلایا، وہاں آپ نے جدہ میں ایک مہینے قیام فرما کر ان کی تکمیل کرائی اور سند واجازت عنایت فرمائی۔ شیخ ایمن جب مئو آئے تھے تو یہاں انھوں نے حضرت محدث الاعظمیؒ سے بخاری شریف کے درس کے ساتھ ساتھ مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ کے پاس صحیح مسلم کی قرأت کی اوران سے اس کی سند حاصل کی تھی۔

ہم نے اپنے مکہ میں قیام کے دوران ایک روز فون کر کے شیخ ایمن کو اپنے آنے کی اطلاع دی، تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا، اوراسی دن انھوں نے شام کے وقت مکہ آنے اور حرم میں ملاقات کرنے کا وعدہ کیا، چونکہ شام کے وقت مکہ میں داخل ہونا اور حرم تک پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے، اس لیے وہ عشاء کے بہت بعد پہنچے، میری ان سے ملاقات تقریباً پچیس سال بعد ہوئی تھی، اور ہم دونوں کے اندر نمایاں تبدیلی آچکی ہے، اس لیے دونوں ہی نے اس تبدیلی پر ایک دوسرے سے اپنی حیرت کا اظہار کیا، لیکن چونکہ فون پر بات ہوچکی تھی، اور ملنے کی جگہ متعین تھی اس لیے الحمدللہ پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اس کے بعد میں ان کو صفۂ ام ہانیؓ پر[1] اس جگہ لے گیا جہاں ہمارے ماموں حضرت مولانا رشید احمد صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ شیخ انتہائی والہانہ، مخلصانہ اور عقیدت مندانہ انداز میں ملے۔ دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتے رہے، مئو میں گزرے ہوئے اوقات کا تذکرہ کرتے رہے، انھوں نے اپنی علمی سرگرمیاں بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ سال بھر صحاح ستہ کے کئی دورے کرتے ہیں، جس کے لیے فرانس، جرمنی اوراٹلی وغیرہ کا سفر ہوتا ہے، اور کئی دورے میں صحاح ستہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ انھوں نے نہایت ممنونیت کے ساتھ حضرت مولانا رشید احمد صاحب سے کہا کہ صحاح ستہ میں بخاری شریف کی سند میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے اور مسلم شریف کی آپ کی روایت سے دیتا ہوں۔ شیخ کی یہ سرگرمیاں قرأت کی تعلیم کے علاوہ ہیں، وہ قرأت کے بڑے ماہر استاد ہیں،

(۱) حرم شریف میں جہاں بیت ام ہانیؓ واقع تھا، اس حصہ کو ذرا اونچا چبوترے کی شکل میں بنایا گیا تھا وہی بیت ام ہانی یا صفۂ ام ہانیؓ کے نام سے موسوم ہے، اب وہ چبوترہ ختم کر کے برابر کر دیا گیا اب اس حصہ کو وہاں موجود کھمبوں ہی سے پہچانا جا سکتا ہے۔

اور عالم اسلام کے چوٹی کے قراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

لیکن جو بات قابل ذکر ہے، اور جس کے ذکر کے لیے یہ تمہید میں نے عرض کی ہے، وہ انتہائی اہم اور خاص طور سے اہل علم کے لیے سبق آموز وبصیرت افروز ہے۔ اہل علم کو معلوم ہوگا کہ شیخ احمد محمد شاکر مصر کے ایک بڑے عالم اور محقق ومحدث تھے، ان کی زندگی کا ممتاز کارنامہ مسند امام احمد بن حنبل کی تحقیق وتحشیہ ہے، جو ان کے حواشی کے ساتھ کئی جلدوں میں شائع ہوئی تھی، یہ کتاب جب چھپ کر حضرت محدث الاعظمیؒ کی نگاہ سے گزری تھی تو آپ نے ان کی تحقیقات پر بہت مفصل استدراک وتعاقب تحریر فرمایا تھا۔ پھر جب اپنے استدراکات کو شیخ احمد شاکر کے پاس بھیجا تھا، تو اس نقد وتعاقب پر چیں بہ جبیں یا کبیدہ خاطر ہونے کے بجائے حد درجہ ممنون ومشکور ہوئے، اور علامہ اعظمیؒ کے پاس تشکر وامتنان کا ایک طویل خط لکھا، جس میں آپ کے علمی مقام اور جلالت رتبہ کا اس طرح اعتراف کیا تھا: **وأنتم من أعظم العلماء بها في هذا العصر** . کہ آپ اس دور میں حدیث وسنت کے عظیم ترین علماء میں سے ہیں۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے ان تمام استدراکات کو شکریہ کے نہایت بلند الفاظ کے ساتھ مسند احمد کی پندرہویں جلد میں شائع کر دیا، آج بھی وہ استدراکات مسند کی پندرہویں جلد میں دعوتِ فکر ومطالعہ دیتے ہیں۔ اس میں شیخ احمد شاکر جگہ جگہ حضرت محدث الاعظمیؒ کی تحقیق ذکر کرنے کے بعد اس پر اپنے تاثرات اور خیالات کا اظہار کرتے ہیں، کبھی کہتے ہیں: **هذا تحقيق جيد**، کہیں لکھتے ہیں: **هذا تحقيق بديع ممتاز**، تو کبھی لکھتے ہیں: **والقول ماقاله العلامة الأعظمي لله درّه**. علم وتحقیق کی دنیا میں یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ ایک محقق اپنی تحقیق کو غلط تسلیم کرتے ہوئے دوسرے کی تحقیق کو حق وانصاف پر مبنی کہے۔

اب سنئے! شیخ ایمن کہنے لگے کہ جب حضرت محدث الاعظمیؒ جدہ میں ان کے ہاں قیام فرما تھے، تو ایک روز وہ مسند احمد کی پندرہویں جلد لائے، اور یہ استدراکات پڑھ کر سنائے، پھر شیخ احمد شاکر کی اس وسعت قلبی کے بارے میں انھوں نے علامہ اعظمیؒ سے کہا: **يا سيِّدي! قَلَّ له نظيرٌ في العالَم**. (یعنی اس وسعت قلبی کی مثال دنیا میں کم ملے گی) شیخ ایمن کی اس بات کے جواب میں علامہ اعظمیؒ نے فرمایا: **قُل لا يوجد** (یعنی یہ نہ کہو کہ اس کی مثال کم ملے گی، بلکہ یہ کہو کہ ملے گی ہی نہیں)۔

شیخ ایمن نے اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے کہا کہ:**قـالــه الشيـخ والـدمع في عينيـه** (یعنی جب حضرت محدث الاعظمیؒ یہ بات فرما رہے تھے تو ان کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھیں)۔

یہ ہے علم کی عظمت، اس کی حرمت اور اس کا تقدس۔ کہ دوسرے کے علمی مقام، اس کے مرتبے اور اس کی علمی فضیلت کے اعتراف میں کسی قسم کے بخل اور تنگ دلی سے کام نہ لیا جائے، اور نہ ہی کسی عالم کو یہ سوچنا چاہئے کہ دوسرے کے فضل وکمال کے اعتراف سے اس کی شان میں فرق آجائے گا، بلکہ جذبہ صرف علم کی خدمت کا ہونا چاہئے، اپنی ذات کا اظہار نہیں ہونا چاہئے۔

شیخ ایمن دورانِ گفتگو کہنے لگے کہ میں نے جب حضرت محدث الاعظمیؒ کے پاس بخاری شریف ختم کی تو میں نے عرض کیا کہ کوئی نصیحت فرمادیں، شیخ نے کہا کہ مولانا رحمہ اللہ نے ایک جملے میں نہایت جامع اور بلیغ نصیحت فرمائی، مولانا نے میری درخواست پر فرمایا کہ:

أوصيک بتحصيل العلم كما هُو.

شیخ نے کہا کہ مولانا کا یہ ایک جملہ نہایت بلیغ اور جامع ہے، پھر شیخ ایمن نے خود ہی اس کی تشریح کرتے ہوئے کہا، مولانا کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ عالم کو ہمیشہ علم کا متبع ہو کر اس کے پیچھے پیچھے چلنا چاہئے، اس کو اپنا راستہ علم کی روشنی میں طے کرنا چاہئے۔**أن تـمشي دائماً وراء العلم لا بـأن تـمشـي والعلم وراء ک.** یہ نہ ہونا چاہئے کہ ایک دلیل محض اس بنا پر آدمی قبول کرلے کہ وہ اس کے ''ہویٰ'' کے مطابق ہے، اور اگر کوئی دلیل اس کے ''ہویٰ'' کے مطابق نہیں ہے، تو صرف اس کی وجہ سے دلیل کو ضعیف و منکر کہہ کر رد کردے۔

شیخ نے نہایت گریہ وزاری کے ساتھ کعبہ شریف کی طرف ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کی کہ **الـلـهـمَّ اجْـمَـعْ بيـنَـنَـا فـي دَارِ عِـزَّتِـکَ وَكَرَامَتِـکَ كَمَا جَمَعْتَنَا فِي هَذَا الْمَقامِ الْكَرِيمِ مَعَ شَيْخِنَا وَمَوْلَانَا حبيبِ الرحمٰن رحمه اللّٰه تعالىٰ.**

مسعود احمد الاعظمی

ماخوذ:ازتفسیرعزیزی (مسلسل)

تفسیر سورۃ التکویر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ۝

جب سورج کی دھوپ تہہ ہوجائے

’’تکویر‘‘ کے معنی لغت میں کسی چیز کے گرد لپیٹنے کے ہیں،عمامے کے پیچ کو’’کور‘‘ کہتے ہیں،’’کورالعمامۃ‘‘اسی سے ہے۔

’’تکویرشمس‘‘میں استعارہ ہے:

تکویر کی نسبت شمس کی طرف کرنے میں استعارہ ہے،آفتاب کی طویل شعاعیں ختم کردینے کو پگڑی کے لپیٹ دینے سے تشبیہ دی ہے،جب اس کی شعاعیں پھیلی ہوئی تھیں تو گویا وہ اس کپڑے کے تھان کی طرح تھا جس کو کھول کر پھیلا دیا گیا ہو،اور شعاعیں جب ختم کردی گئیں اور اس کا وجود ٹکی کی طرف رہ گیا تو گویا ان شعاعوں کو کپڑے کے تھان کی طرح لپیٹ دیا گیا۔

حدیث شریف میں آتا ہے ’’**الشمس والقمر ثوران مکوران یوم القیامۃ**‘‘یعنی قیامت کے دن سورج اور چاند پنیر کی دو چکیوں کی طرح بے نور پڑے ہوں گے،بعض روایات میں ’’ثورانِ عقیرانِ‘‘ کے الفاظ بھی آئے ہیں،یعنی کٹی ہوئی کونچوں والے دو بیلوں کی طرح ہوں گے، ان کا دوروسیر جو جاری رہا کرتا تھا سب ختم ہوچکا ہوگا۔

حدیث میں چاندوسورج کو،ثوران مکوران کہنے کی وجہ:

’’ثور‘‘لغت میں بیل کو کہتے ہیں اور پنیر کی چکی کو بھی کہتے ہیں،جب ستاروں کی ارواح کا تعلق ستاروں کے وجود سے منقطع ہوجائے گا تو ستاروں کا نور بھی زائل ہوجائے گا،اوران کا دوروسیر

یعنی اپنی منازل کی طرف چلنا، آنا جانا، یہ بھی ختم ہوجائے گا، حدیث میں زوالِ نور کی طرف نظر کر کے ان کو پنیر کی چکی سے تشبیہ دی گئی اور کبھی ان کی حرکت کے ختم ہوجانے کی طرف نظر کر کے کٹی ہوئی کونچوں والے بیلوں سے ان کو تشبیہ دی گئی ہے۔

صرف تکویرِ شمس کے ذکر کی وجہ:

اس حادثے میں حدیث کی رُو سے اگر چہ سورج و چاند دونوں ہی بے نور ہوجائیں گے مگر سورت میں صرف سورج کے بے نور ہونے کا خاص طور پر اس لیے ذکر کیا ہے کہ چاند کی روشنی ذاتی نہیں سورج کی روشنی سے ہی چاند بھی روشن ہوتا ہے، جب سورج کے بے نور ہونے کا ذکر کر دیا گیا تو خود ہی چاند کا بے نور ہوجانا بھی معلوم ہوگیا، اس کے بے نور ہونے کو علیحدہ سے بیان کرنے کی ضرورت نہ رہی۔

وَاِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ ○

اور جب تارے میلے ہوجائیں

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ستارے نور کی زنجیروں میں لٹکتے ہیں، وہ زنجیریں فرشتوں کے ہاتھوں میں ہیں، جب فرشتے مرجائیں گے زنجیریں ان کے ہاتھوں سے گرجائیں گی، ستارے گر کر بکھر جائیں گے اور بے نور ہوجائیں گے۔

ستاروں پر جو انقلاب آنے والا ہے اس سورت میں اس انقلاب کی انتہاء کا ذکر ہے (یعنی اولاً وہ ٹوٹ کر بکھریں گے، یہ اس انقلاب کی ابتداء ہے پھر بے نور ہوجائیں گے یہ اس انقلاب کی انتہاء ہے) اور اگلی سورت میں اس انقلاب کی ابتداء کا ذکر ہے۔

سورۂ تکویر میں ''نجوم'' اور سورۂ انفطار میں ''کواکب'' کا لفظ اختیار کرنے کی وجہ:

یہاں ''نجوم'' کا لفظ اختیار کیا گیا ہے اور اگلی سورت ''انفطار'' میں ''کواکب'' کا لفظ آیا ہے اس کی ایک وجہ تو اسلوب میں تفنن ہے (جو بلاغت کا حصہ ہے) دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ''نجم'' کے لفظ سے ذہن فوراً ظہور طلوع اور اشراق کی طرف جاتا ہے، اس لیے روشنی و چمک کے مناسب انکدار (بے نور ہونا) ہے (یہاں انکدار کی نسبت کی جارہی ہے لہٰذا ''نجم'' کا لفظ اختیار کیا گیا)

اور ''کواکب'' کے لفظ سے استقرار واستحکام سمجھا جاتا ہے اس کے مناسب انتشار ہے (اس لیے وہاں ''کواکب'' کا لفظ آیا ہے تاکہ اس کی طرف انتشار (انتثار) کی نسبت کی جائے)

وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝

اور جب پہاڑ چلائے جائیں

یعنی بادلوں کی طرح ہواؤں میں اڑائے جائیں گے، پہاڑ جو زمین کو اپنے بھاری وزن کے ذریعہ ہلنے سے روکے ہوئے تھے، زمین کا ٹھہراؤ انہی کے بل بوتے پر تھا، جب ان کی یہ حالت ہوگی تو زمین کو بھی اسی پر قیاس کر لینا چاہئے کہ اس کی خرابی کا کیا حال ہوگا۔

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝

اور جب بیاتی اونٹنیاں چھٹی پھریں

یعنی جب دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی، ان کے مالک ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دیں گے۔

گابھن اونٹنی کی تخصیص کی وجہ:

اس جگہ گابھن اونٹنی کا خاص طور پر اس لیے ذکر فرمایا کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان اپنے مال واسباب سے کتنا بے تعلق ہو چکا ہوگا، اور تمام اموال میں جانور سب سے زیادہ حفاظت وخبر گیری کے محتاج ہوتے ہیں، زر وجواہر، کھیتی باڑی، باغات اور عمارات اتنی زیادہ خبر گیری کے محتاج نہیں ہوتے، جانوروں کی طرف انسان کی ہر وقت توجہ رہتی ہے، کبھی دھوپ سے سائے میں باندھنا، کبھی سائے سے دھوپ میں باندھنا، پھر چارہ دانہ پانی کی فکر رہتی ہے کہ جانوروں کی ضرورت ہے، جب کہ دوسرے اموال کو حفاظت میں رکھنے کے بعد کچھ بے فکری حاصل ہو جاتی ہے۔

دوسرے، اہل عرب کے نزدیک گابھن اونٹنی انتہائی قیمتی مال سمجھا جاتا تھا، اس لیے کہ اس میں دو خوشیاں ہوتی تھیں ایک بچہ جننے کی، دوسری دودھ کی کہ یہ جانور دوسرے جانوروں کے مقابلے میں دوگنا تین گنا زیادہ دودھ دینے والا ہوتا تھا، لہٰذا ایسے قیمتی مال کی طرف بہت توجہ اور اس کے ساتھ خاص قلبی لگاؤ ہوتا ہے، چونکہ قرآن کے مخاطبِ اول اہلِ عرب ہی تھے اس لیے بلاغت کے تقاضے

کے مطابق وہ چیز ذکر فرمائی جوجلد ان کی سمجھ میں آجائے۔

(ایسی چیز جس کے ساتھ تعلق ولگاؤ کی گوناگوں وجوہات ہیں اس کے باوجود اس دن کی ہولناکی کا یہ عالم ہوگا کہ انسان اس سے بےتعلق ہوجائے گا)

ایک اشکال اور اس کا حل:

یہاں پر ایک اشکال ہے جس کو بہت سے ذہین لوگ مشکل سمجھتے ہیں، حاصل اس کا یہ ہے کہ جب صور پھونکا جائے گا تو تمام جانور مرجائیں گے، اس کے بعد قیامت قائم ہوگی اس وقت اونٹنیاں کہاں ہوں گی جو چھٹی پھریں گی، اور صور پھونکنے سے پہلے اگر فرض کریں تو اس وقت قیامت ہی قائم نہ ہوئی ہوگی کہ اس کی وجہ سے اونٹنیاں معطل پھریں، پھر یہ کس وقت کی بات ہے؟ اکثر عقلا و دانشمندوں نے اس کا حل یہ پیش کیا ہے کہ یہ ایک فرضی وخیالی بات ہے، کہ بالفرض اگر اس دن گابھن اونٹنیاں ہوں تو وہ چھٹی پھریں ایسا شدید اور خوفناک دن ہوگا، ان کی طرف کوئی توجہ بھی نہ کرے جیسے۔ ''**یوم یجعل الولدان شیبا**'' میں یہی بات کہی گئی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق:

تأمل وغور کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس تکلف کی ضرورت نہیں جو لوگوں نے کیا ہے، اس لیے کہ جب اسرافیل علیہ السلام صور پھونکیں گے اس وقت سب انسان و جانور جن میں یہ حاملہ اونٹنیاں بھی ہوں گی مرجائیں گے، پھر دوبارہ صور پھونکیں گے تو سب زندہ ہوجائیں گے، جن میں دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں بھی ہوں گی وہ اسی حالت میں زندہ ہوں گی، چونکہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جو جس حال میں مرے گا اسی حال میں اٹھایا جائے گا، چنانچہ ان اونٹنیوں کے مالک اس وقت ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کریں گے۔

''عشار'' کی ایک اور تفسیر:

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''عشار'' سے مراد بادل ہیں، کیونکہ عرب بادلوں کو حاملہ جانور کی طرح قرار دیتے ہیں، جس طرح جانوروں میں نر مادہ کے ملاپ سے حمل قرار پاتا ہے، اسی طرح بادلوں میں ہوا کے ملاپ کی وجہ سے پانی بھرجاتا ہے، گویا ہوا نر کی طرح اور بادل مادہ کی مانند ہوئے، اب معنی یہ ہوں گے کہ بادل اس دن پانی سے خالی ہوں گے کسی کام کے نہ ہوں گے، لیکن اس تفسیر

میں جو کچھ بُعد ہے وہ ظاہر ہے۔

’’عشار‘‘ کی وجہ تسمیہ:

عشار عشراء کی جمع ہے جیسے نفاس، نفساء کی جمع ہے، عشراء دس مہینے کی گابھن اونٹنی کو کہتے ہیں، سال پورا ہونے تک اس کو یہی کہتے ہیں اگرچہ اونٹنی کی کل مدتِ حمل پورا سال ہے، اس لیے اس کو یہاں اس نام سے ذکر فرمایا۔

وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ○

اور جب جنگل کے جانوروں میں رول پڑ جائے

یعنی جس وقت وحشی جانور جمع کیے جائیں گے، یعنی وہ جانور جو پہاڑوں اور جنگلوں میں رہنے والے ہیں، وہ انسانوں کے ساتھ آ کر جمع ہو جائیں گے، یہ اس وجہ سے ہوگا کہ پہاڑ اور جنگل خراب ہو جائیں گے، آگ اور دھواں ہر طرف سے آ کر ان جانوروں کو گھیرے گا وہ بدحواس ہو کر انسانوں کے مجمعوں میں آ کر گھسیں گے، جیسے سرد علاقوں میں برف پڑنے کے زمانے میں وحشی جانور لوگوں کے گھروں میں آ کر گھستے رہتے ہیں اور وحشت بھول جاتے ہیں۔

اس واقعہ میں واضح دلیل ہے اس بات کی کہ اس دن کی ہولنا کی اتنی شدید ہوگی کہ وحشی جانوروں کو انسانوں سے طبعی نفرت نہ رہے گی، ایک دوسرے سے جو طبعی خوف ہے وہ بھی اس دن نہیں رہے گا۔

حشرِ وحوش کی دوسری تفسیر:

حضرت قتادہ اور دوسرے مفسرین نے کہا ہے، ان وحشیوں کے حشر سے مراد ان کا زندہ کرنا ہے، قصاص کے لیے ان جانوروں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا، چنانچہ حدیث میں ہے کہ جانوروں میں بھی قصاص جاری ہوگا، یہاں تک کہ بے سینگ والی بکری کو سینگ والی بکری سے قصاص دلایا جائے گا، قصاص ہو جانے کے بعد سب خاک کر دیئے جائیں گے۔

بعض جانور جنت میں ہوں گے اور بعض دوزخ میں:

جو جانور اللہ کے نام پر ذبح کیے گئے تھے وہ جنت کی خاک بنیں گے، مگر وہ جانور جو جنت

والوں کی تفریح اور خوشی کا ذریعہ ہوں گے وہ جنت میں باقی رہیں گے، جیسے مور، گھوڑا یا اور کوئی خوبصورت یا خوش آواز جانور، اس کے علاوہ وہ جانور جو جنت والوں کی پسندیدہ غذا ہوں گے وہ بھی ہوں گے، چنانچہ سورۂ واقعہ میں اس کا ذکر آیا ہے ''وَلَحۡمِ طَيۡرٍ مِّمَّا يَشۡتَهُوۡنَ''

اسی طرح وہ جانور جو دوزخیوں کی تکلیف وعذاب کا ذریعہ ہوں گے، وہ دوزخ میں رہیں گے جیسے سانپ، بچھو، اور مکھی، مکھی ان کے جلے بُھنے بدن پر بیٹھے گی جس سے ان کی تکلیف میں اضافہ ہوگا، لیکن اللہ کی قدرت سے ان جانوروں کو دوزخ کی آگ سے کچھ تکلیف نہیں پہنچے گی، حدیث شریف میں آتا ہے ''الذباب کله فی النار'' اور دوسری حدیث میں آتا ہے ''ان فی الجنة طیراً ناعمة وأکلها انعم منها''

وَاِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ ۝

اور جب دریا جھونکے جائیں

یعنی جس دن دریا بھڑکائے جائیں گے، ان کا پانی آگ اور دھواں بن جائے گا، یہ آگ اور دھواں جب ہوا کے ساتھ ملے گا تو ہوا کے اندر گرمی اور حرارت بہت زیادہ ہوجائے گی، جس کی وجہ سے اہل محشر کو سخت تکلیف ہوگی، لیکن ایمان والوں کو اس سے کچھ زیادہ تکلیف نہیں ہوگی، صحیح حدیث میں آتا ہے کہ اس دن دھوئیں سے اہل ایمان کو زکام سا ہوگا اس سے زیادہ تکلیف نہیں ہوگی۔

وَاِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ ۝

اور جب جیوں کے جوڑے باندھے جائیں

یعنی نفوس انسانی کو آسمان وزمین کے نفوس کے ساتھ ملایا جائے گا تاکہ انسانی نفوس کے اندر خیر وشر معلوم کرنے کی قوت زیادہ ہوجائے اس کے نتیجے میں وہ ہر عمل کی پوری سزا کا احساس پورے کامل درجے میں کرسکیں۔

<u>تزویج نفوس کی تفسیر میں دوسرا قول:</u>

بعض نے کہا ہے تزویج نفوس سے مراد روحوں کا اپنے جسموں سے ملنا ہے۔

تیسرا قول:

بعض نے کہا کہ تزویج تقسیم کے معنی میں ہے یعنی لوگوں کی تین قسمیں کر دی جائیں گی جس کی تفصیل سورۂ واقعہ کی اس آیت میں ہے ''وَ کُنْتُمْ اَزْوَاجاً ثَلَاثَۃً''

چوتھا قول:

بعض نے کہا ہے کہ ہر شخص کو اپنے ہم مشرب وہم مذہب آدمی کے ساتھ اکٹھا کر کے سب لوگوں کے الگ الگ گروہ بنا دیئے جائیں گے، خیر وشر کے طبقوں کی رعایت کے ساتھ یہ ترتیب ہوگی (سو تزویج نفوس سے یہی مراد ہے)

پانچواں قول:

بعض نے کہا ہر شخص کا حشر اس کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ دنیا میں وہ بہت زیادہ محبت رکھتا تھا چاہے جس سے وہ محبت رکھتا تھا وہ نیک ہو یا برا، جیسے استاذ، پیر ومرشد اور بادشاہ وامیر، (تو تزویج نفوس سے ان کے ہاں یہ مراد ہے)

چھٹا قول:

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ مؤمنین کی روحوں کو ''حورعین'' کے ساتھ ملا دیا جائے گا اور کافروں کی روحوں کو شیطانوں کے ساتھ جوڑ دیا جائے گا (تزویج نفوس کی تفسیر ان کے ہاں یہ ہوئی)

ساتواں قول:

زجاجؒ نے کہا ہے کہ ہر انسان کو اس کے عمل کی صورت مثالی کے ساتھ اکٹھا کیا جائے گا خواہ اس کے اعمال نیک ہوں یا بُرے ہوں (تزویج نفوس کا یہی معنی ہے)

وَاِذَا الْمَوْءٗدَۃُ سُئِلَتْ ۝

اور جب بیٹی جیتی گاڑ دی گئی کو پوچھیں

یعنی جب موؤدۃ سے پوچھا جائے گا، موءودۃ لغت میں اس لڑکی کو کہتے ہیں جو زندہ گاڑ دی گئی ہو یہ لفظ مشتق ہے ''وأد یئد'' سے۔

عرب کے معاشرے میں یہ رسم تھی کہ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفنا دیا کرتے تھے، اور اس رسمِ بد کے مختلف اسباب تھے۔

لڑکیوں کو زندہ دفنانے کے اسباب:

بعض اس وجہ سے زندہ دفناتے تھے کہ تنگ دستی کا خوف تھا، لڑکی کی شادی بیاہ کے اخراجات کے ڈر سے ایسا کرتے تھے، بعض اس عار و شرم میں مبتلا تھے کہ ہم بیٹی کسی کو دیں گے تو وہ ہمارا داماد کہلائے گا اس بات کو وہ عار سمجھتے تھے، اس فاسد و بے ہودہ خیال میں گرفتار ہو کر یہ بدترین کام کرتے تھے، اس زمانہ میں اس بدترین عمل کا کچھ ایسا رواج پڑ گیا تھا کہ لوگ اس کو غیرت مندی سمجھتے اور اس پر فخر کرتے تھے، اس بدترین گناہ کے ارتکاب پر انہیں عذاب کا خوف بھی نہیں تھا، قرآنِ کریم نے جا بجا ان کے اس بُرے فعل کی مذمت کی ہے۔

لڑکیوں کو زندہ دفنانے کی برائیاں:

اس قبیح فعل میں بہت سی برائیاں ہیں ایک تو یہ کہ اس میں قطع رحمی ہے اپنی اولاد کو زندہ در گور کرنا سب سے بڑی قطع رحمی ہے، دوسرے ظلم و ستم ہے، ایک معصوم و بے گناہ کا خونِ ناحق ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ارادے و مرضی پر ناخوش ہونا ہے کہ اس نے لڑکی پیدا کیوں کی، اللہ تعالیٰ کا مقابلہ کرنا لازم آتا ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے نو مہینے ماں کے پیٹ میں پرورش کیا اس کے پیدا ہوتے ہی اس کو ہلاک کر ڈالنے کا ارادہ کیا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے رزاق و کارساز ہونے پر بے اعتمادی کا اظہار ہے، اس کے ساتھ انتہائی درجے کا بخل بھی ہو رہا ہے کہ اولاد پر خرچ کرنے کی بجائے اولاد کو ہلاک کرتا ہے۔

اسی طرح اور بہت سی قباحتیں ہیں، خود عرب کے اندر جو سمجھ دار لوگ تھے انہی برائیوں کے معلوم ہو جانے کے بعد وہ اس فعل قبیح سے دوسروں کو روکتے تھے، لیکن قوم کی رسم کے سامنے مجبور و بے بس تھے۔

زید بن عمرو بن نفیل کا کارنامہ:

چنانچہ حضرت امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی زید بن عمرو بن نفیل زمانۂ جاہلیت میں اس رسمِ بد کے سدِ باب کی کوشش میں سرِ فہرست تھے، جہاں سنتے کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے اور اس کے زندہ در گور ہونے کا اندیشہ ہے وہ فوراً وہاں پہنچتے گھر والوں سے کہتے بس یہ میری بیٹی ہے اس کے کھانے پینے کے جملہ اخراجات شادی بیاہ تک سب میرے ذمے ہیں، اس طرح

انھوں نے بہت سی لڑکیاں بچالیں، اسی وجہ سے ان کا لقب ''محی الاموات'' مشہور ہوگیا تھا (یعنی مردوں کو زندہ کرنے والے)

ان کو دیکھ کران کی اتباع میں دوسرے قبائل میں بھی بہت سے ایسے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے جو اس رسمِ بد کو روکنے کے لیے کوشش کرنے لگے، انہی میں فرزدق شاعر کے دادا ''صعصعہ'' بھی ہیں، اسی وجہ سے فرزدق نے اپنے اشعار میں اپنے دادا کی بہت تعریف کی ہے۔

چھوڑے ہوئے گناہ میں شیطان کے پھنسانے کا طریقہ:

یہ گناہ امت میں ایک نئے طریقے سے ظاہر ہوا ہے، اور شیطان کے گمراہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب لوگ کسی گناہ کو شرعی یا عقلی دلائل کی وجہ سے بُرا جان کر چھوڑ دیتے ہیں تو شیطان اسی گناہ کو کسی نئی صورت میں لوگوں کی نظروں میں عمدہ کرکے پیش کرتا ہے تاکہ اس کا اصل مقصد فوت نہ ہو، زندہ درگور والے گناہ کو اس طرح نئی صورت میں ظاہر کیا ہے کہ اگر کسی کولونڈی یا کم اصل بیوی کے حمل ٹھہر جاتا ہے تو وہ اس حمل کو چار ماہ گذرنے کے بعد بھی جب کہ روح پڑ چکی ہوتی ہے گرادیتا ہے تاکہ کسی کم اصل آدمی کو داماد نہ بنانا پڑ جائے، پھر اس بُرے فعل پر وہ فخر بھی کرتا ہے، حالانکہ اس بدترین فعل اور بچی کو زندہ درگور کرنے کے درمیان سِرِ موفرق نہیں ہے۔

روح پڑنے سے پہلے حمل گرانے کی تحقیق:

اس میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اختلاف ہوا ہے کہ جان پڑنے سے پہلے حمل گرانا جائز ہے یا نہیں؟ بعض فرماتے تھے کہ عذرِ شرعی کی وجہ سے گرادینا جائز ہے، مثلاً ولادت کی تکلیف کا تحمل اگر نہ ہو، یا عیال کی کثرت ہے، یا تنگ دستی ہے، یا مسافرت سے دوچار ہے، یا لونڈی ہے اس کے متعلق یہ خیال ہے کہ بچہ کی پیدائش کے بعد خدمت کی نہیں رہے گی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دربار میں اس بارے میں بہت گفت وشنید جاری رہی یہاں تک کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''واللّٰہ لا تکون موء ودۃ حتی تأتی علیه التارات السبع'' (۱)

(۱) خدا کی قسم وہ موءودۃ نہیں کہلائے گی جب تک اس پر سات دور نہ گذر جائیں، حمل پر سات دور گذرتے ہیں ہر دور چالیس دن کا ہوتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ حمل جب تک نو ماہ کا نہ ہوجائے اس کا گرانا موءودۃ کے حکم میں نہیں ہے ۱۲ سفیر احمد

اس بات کوحضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پسند فرمایا اوراسی پر فیصلہ ہوگیا،لیکن بعض صحابہ کرام احتیاط کے پیشِ نظر اس کے جواز کے قائل نہ تھے،اس کوموءودۃ صغریٰ کہا کرتے تھے اس لیے کہ یہ اگرچہ قتلِ نفس کا عمل نہیں ہے،تاہم رزق کے معاملے میں عدمِ توکل،اورصورتاً اللہ کے فعل کے ساتھ معارضہ بالضد لازم آرہا ہے اس کے علاوہ دیگر قباحتیں بھی پائی جاتی ہیں۔

لیکن صحیح بات یہی ہے کہ یہ جائز ہے عزل پر قیاس کرتے ہوئے۔

عزل اور مانع حمل ادویہ کا حکم:

حدیث میں عزل کے بارے میں جو''ذلک وأد خفی'' کے الفاظ آئے ہیں اس سے عزل کے حرام ہونے پر دلالت نہیں ہوتی،ہاں کراہت ثابت ہوتی ہے،اوراس سے اس طرف اشارہ ہے کہ عزل کے نتیجے میں اولاد کا حصول نہ ہوسکے گا،یہ مطلب نہیں کہ جو حکم وأدجلی کا ہے وہی وأدخفی کا ہے،خفی اس کے طرفِ جلی کے حکم میں نہیں ہوتا،مثلاً ریا کوشرکِ خفی کہا گیا ہے لیکن وہ شرکِ جلی کے حکم میں نہیں ہے۔

اورعزل کا جواز روایات صحیحہ مشہورہ سے ثابت ہے''لا شبهة فيه'' اسی طرح مانع حمل دوائیں استعمال کرنا،حمل سے پہلے یا بعد،عزل کی طرح جائز ہے۔

ایک شبہے کا ازالہ:

یہاں اکثر لوگوں کوایک شبہہ ہوتا ہے کہ موءودۃ بے چاری تو مظلوم ماری گئی اس سے سوال کے کیا معنیٰ؟ سوال تو قاتل سے ہونا چاہئے تھا کہ تونے اس کو کیوں قتل کیا تاکہ سرزنش ہوتی؟

جواب اس کا یہ ہے کہ موءودۃ سے سوال اس طرح نہیں ہوگا کہ تو کیوں قتل ہوگئی؟ بلکہ اس انداز سے ہوگا کہ تو کس جرم کی وجہ سے قتل کی گئی؟ ظاہر ہے یہ سوال مظلوم سے ہی کیا جانا چاہئے کیونکہ اس سے مقصد دعویٰ کرنے کی تلقین ہے کہ وہ کہہ سکے مجھے بلاوجہ فلاں نے قتل کیا اور مجھ پر ظلم کیا۔

الازہارالمربوعہ

باب دوم

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

بحث دلالت اجماع برنسخ

اس کے بعد مجیب صاحب نے اس پر بہت طویل مگر بے مغز بحث کی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اپنی حدیث کے خلاف جوفتویٰ دیا ہے اس کی وجہ سے امام شافعی کا حدیث ابن عباسؓ کو منسوخ کہنا صحیح نہیں ہے، اورخواہ مخواہ درمیان میں امام طحاوی کے جواب نسخ کا ذکر بھی چھیڑ دیا ہے، میں پہلے امام طحاوی کے جواب پر روشنی ڈالتا ہوں، اس کے بعد امام شافعی کے جواب کی متانت ثابت کروں گا۔

امام طحاوی کے دعوائے نسخ کی تائید وتشئید:

امام طحاوی کے دعویٰ کا حاصل یہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے وقوع ثلاث کو نافذ کیا تو کسی شخص نے بھی ان کی مخالفت نہیں کی، لہٰذا یہ اس بات کی بہت بڑی حجت ہے کہ پہلے جو کچھ تھا یعنی تین کا ایک ہونا وہ منسوخ ہو چکا ہے۔ علامہ عینی نے امام طحاوی کی اس تقریر کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

فإن قلت هذا إجماع على النسخ من تلقاء أنفسهم فلا يجوز ذٰلک في حقهم، قلت يحتمل أن يكون ظهر لهم نص أوجب النسخ ولم ينقل إلينا، یعنی اگر تم کہو کہ یہ صحابہ کا اپنی طرف سے پہلے حکم کے نسخ پر اجماع کرنا ہوا، اور صحابہ کے حق میں یہ گمان کرنا جائز نہیں ہے، تو میں کہوں گا کہ ممکن ہے ان کو کوئی موجبِ نسخ نص معلوم ہوئی ہو اور وہ ہم تک نقل نہ ہوئی ہو۔

علامہ عینی نے جو سوال و جواب لکھا ہے اس کا منشاء صرف یہ ہے کہ امام طحاوی کی تقریر پر کوئی ناسمجھ آدمی یہ شبہہ نہ کرے کہ انھوں نے صحابہ کو حکم نبوی کا منسوخ کرنے والا قرار دے دیا، اس لیے کہ

امام طحاوی کی یہ مراد نہیں ہے، بلکہ یہ مراد ہے کہ صحابہ نے کسی نص کی بنا پر پہلے حکم کے خلاف پر اجماع کیا لہٰذا ناسخ وہی نص ہے۔

مجیب صاحب کو چونکہ امام طحاوی اور ہر اس امام وعالم سے بغض ہے جو ان کے خلاف کہے، اس لیے انھوں نے لکھا ہے کہ علامہ عینی کو امام طحاوی کی دلیل کمزور نظر آئی اس لیے یہ اعتراض وجواب کرکے اس کو مضبوط کرتے ہیں۔ سچ ہے ع گل است وسعدی در چشم دشمناں خار است۔

مجیب صاحب سے کوئی پوچھے کہ مفسرین وشراح حدیث جہاں جہاں کسی آیت یا حدیث کا معنی بیان کرکے اعتراض وجواب کرتے ہیں، ان سب مقامات میں آپ کے نزدیک ان کو آیت وحدیث کا معنی کمزور نظر آیا ہے، اس لیے ان لوگوں نے اعتراض وجواب کرکے اس کو مضبوط کیا ہے (معاذ اللہ)۔ یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بہر حال امام طحاوی کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے اجماع صحابہ کو حدیث ابن عباسؓ کے نسخ کی دلیل قرار دیا ہے۔ اور اجماع کا دلیل نسخ ہونا اصول حدیث میں پوری صراحت کے ساتھ موجود ہے، چنانچہ امام ابوعمرو بن الصلاح نے علوم الحدیث ص ۱۱۴ میں اور امام نووی وعلامہ سیوطی نے تقریب وتدریب ص ۱۹۶ میں اور حافظ عراقی وعلامہ سخاوی نے الفیۃ الحدیث وفتح المغیث ص ۳۵۸ میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔ سب کی عبارتیں نقل کرنے میں طوالت ہوگی صرف ابن الصلاح کی عبارت ملاحظہ ہو:

ومنها ما يعرف بالاجماع كحديث قتل شارب الخمر فى المرة الرابعة فانه منسوخ عرف نسخه بانعقاد الاجماع على ترك العمل به والاجماع لا ينسخ ولا ينسخ ولكن يدل على وجود ناسخ غيره. یعنی نسخ کی قسموں میں ایک وہ بھی ہے جو اجماع سے معلوم کی جاتی ہے، جیسے شرابی کو چوتھی دفعہ میں قتل کرنے کی حدیث کہ وہ منسوخ ہے، اور اس کا منسوخ ہونا یوں معلوم ہوا ہے کہ اس کے موافق عمل نہ کرنے پر اجماع منعقد ہو گیا ہے، اور اجماع بذات خود ناسخ ہوتا ہے نہ منسوخ، ہاں کسی دوسرے ناسخ کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔ اس تصریح کی موجودگی میں امام طحاوی کے دعوائے نسخ کا جواب دینا کھیل نہیں ہے، اس لیے مجیب صاحب نے اپنی درماندگی کا احساس کرکے امام طحاوی وامام شافعی دونوں کے دعووں کو ایک قرار دے دیا اور صرف امام شافعی کے دعوی پر کچھ کلام کرکے اپنے معتقدوں کو یہ سمجھا دیا کہ امام طحاوی وامام شافعی دونوں کا جواب

ہوگیا، حالانکہ امام شافعی فتویٰ ابن عباسؓ کو دلیل نسخ کہتے ہیں، اور امام طحاوی اجماع صحابہ کو، اور فتویٰ ابن عباسؓ کے دلیل نسخ نہ بن سکنے سے یہ کسی طرح لازم نہیں آتا کہ اجماع صحابہ بھی دلیل نسخ نہ بن سکے۔ حاصل یہ کہ امام طحاوی کا کوئی جواب مجیب صاحب سے نہ بن سکا۔

بحث فتویٰ صحابی بخلاف حدیث خود

امام شافعی کے دعویٰ نسخ پر مجیب کا کلام:

اب رہا امام شافعی کا دعویٰ نسخ، تو مجیب صاحب نے اس کو رد کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بجائے نہ رسیدند کا مضمون ہے۔ مجیب صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ راوی جب اپنی روایت کے خلاف فتوے دے تو اس کی روایت کا اعتبار کیا جائے گا نہ کہ اس کی رائے کا، اور اس کی تائید میں چند علما کے اقوال نقل کیے ہیں۔

میری پہلی گذارش مجیب صاحب سے یہ ہے کہ آپ نے یہاں جو بحث چھیڑی ہے، وہ خالص اصولی بحث ہے، اور ہر مذہب کے اصول کا ماخذ صاحبِ مذہب کا طریقِ عمل ہے، جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے انصاف ص ۵۱ میں لکھا ہے، پس ابن حجر یا غزالی شافعی نے جو کچھ لکھا ہے وہ اگر امام شافعی کے طریقِ عمل کے موافق ہے تو صحیح ہے ورنہ غلط ہے۔ اب آپ خود دیکھئے کہ امام شافعی تو ابن عباسؓ کے فتویٰ کا اعتبار کرتے ہیں اور ابن حجر و غزالی کے کلام سے لازم آتا ہے کہ حدیث ابن عباسؓ کا اعتبار کیا جائے، پس ان دونوں حضرات نے جو اصول بیان کیا وہ امام شافعی کے طریقِ عمل کے خلاف ٹھہرا، لہٰذا یہ اصول صحیح نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ اصول مذہب کا ماخذ صاحب مذہب کا طریق عمل ہوتا ہے۔ نیز یہ عجب الٹی بات ہے کہ آپ ابن حجر و غزالی کے اقوال کو امام شافعی پر حجت گردانتے ہیں، حالانکہ یہ دونوں بزرگ امام شافعی کے مقلد ہیں، لہٰذا امام شافعی کا قول خود ان دونوں حضرات پر حجت ہوگا، نہ کہ ان کا قول امام شافعی پر حجت ہو۔ ان حضرات نے اگر یہ لکھا ہے کہ صورت مذکورہ میں حدیث کا اعتبار رہوگا، فتویٰ صحابی کا نہیں، تو یہ حضرات جواب دہ ہیں کہ امام شافعی کی تقلید اور ان کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے ایسا کیوں کہتے ہیں، نہ کہ امام شافعی جواب دہ ہوں کہ آپ نے ابن حجر و غزالی کے لکھے ہوئے اصول کے خلاف کیوں فرمایا۔ اسی طرح شوکانی یا مولانا عبدالحی رحمہ اللہ کے اقوال سے بھی امام شافعی کو پابند نہیں کیا جاسکتا، بلکہ

ان کوخود ان کے یا اس شخص کے قول کا پابند کیا جاسکتا ہے جس کا قول ان پر حجت ہوسکتا ہو۔

دوسری گذارش یہ ہے کہ آپ نے امام شافعی سے بہت متاخر علماء کے اقوال تو ان کے خلاف نقل کر دیئے، لیکن امام شافعی نے جس دلیل سے حضرت ابن عباسؓ کے فتویٰ کو ان کی حدیث کے مقابلہ میں قابل اعتبار قرار دیا ہے اور اس کو دلیل نسخ کہا ہے اس کا کوئی جواب آپ نے نہیں دیا۔ امام شافعی کی اس دلیل کی توضیح یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ آنحضرت ﷺ کے عہد میں تین طلاقوں کا ایک ہونا روایت کرتے ہیں، اور خود ہی اس کے خلاف فتوی دیتے ہیں، پس دو حال سے خالی نہیں، یا تو ابن عباس رضی اللہ عنہما کو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کے ایک ہونے کے خلاف بھی حکم دیا ہے، اس لیے انھوں نے بھی تین کے ایک ہونے کے خلاف فتویٰ دیا۔ یا حضرت ابن عباسؓ کو تین کے ایک ہونے کے خلاف کوئی حکم نبوی معلوم نہیں، پھر بھی وہ تین کے ایک ہونے کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں۔ اگر پہلی صورت ہے تو حضرت ابن عباسؓ کا فتویٰ اس بات کی دلیل ہے کہ تین کے ایک ہونے کے خلاف جو حکم آنحضرت ﷺ نے دیا، وہ بعد کا حکم ہے اور پہلے حکم کا ناسخ ہے، اس لیے کہ اگر ایسا نہ ہوتو لازم آئے گا کہ حضرت ابن عباسؓ نے آخری اور ناسخ حکم کو چھوڑ کر اول اور منسوخ پر فتویٰ دیا، حالانکہ اصول یہ ہے کہ **انما یوخذ بالآخر فالآخر من فعل رسول الله** یعنی آنحضرت ﷺ کے آخری فعل کو لیا جاتا ہے (بخاری) اور اگر دوسری صورت ہے تو لازم آئے گا کہ حضرت ابن عباسؓ نے حدیث نبوی کی۔جس کو انھوں نے خود روایت کیا ہے۔ بلا وجہ شرعی مخالفت کی (معاذ اللہ) اور حضرت ابن عباسؓ کی شان اس سے بہت بالاتر ہے۔ اور اگر کوئی بدبخت ہمت کر کے یہ کہہ دے کہ ہاں ہاں ابن عباسؓ نے بلا وجہ شرعی حدیث کی مخالفت کی تو پھر وہ حدیث ابن عباسؓ کو کس منھ سے پیش کرسکتا ہے، یا جب وہ خود یہ عقیدہ فاسد رکھتا ہے کہ ابن عباسؓ نے معاذ اللہ بلا وجہ شرعی حدیث کی مخالفت کی تو ایسے شخص کی روایت کب قابل قبول ہوسکتی ہے۔

بتایئے! آپ نے اس دلیل کی کس بات کا جواب دیا۔ ظاہر یہ ہے کہ آپ دوسری صورت کو اختیار کرتے ہوں گے، لہٰذا آپ کو چاہئے تھا کہ مخالفت کی کوئی قابل قبول وجہ بیان کرتے۔ اگر کہئے کہ میں نے آثار ص ۲۹ میں لکھ دیا ہے کہ ''راوی کے ترک حدیث کی بہت سی وجہیں اجتہادی وغیر اجتہادی ہوسکتی ہیں، پس ان احتمالات کے ہوتے ہوئے حدیث ہرگز ترک نہیں کی جاسکتی'' تو گزارش ہے کہ

آپ نے جن وجھوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ دو ہیں، ایک اعتقاد ندب دوسرے احتمال نسیان۔ ان میں سے پہلی وجہ تو خود آپ کے نزدیک بھی یہاں پر مستقیم نہ ہوگی، اس لیے اس پر بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر آپ اس کی استقامت ثابت کردیں تو ہم بھی اس پر بحث کردیں گے۔ اب رہی دوسری وجہ یعنی احتمال نسیان تو اولاً یہ نہایت بعید ہے کہ ابن عباسؓ ایک حدیث کو عہد نبوی سے لے کر تابعین کے زمانہ تک یاد رکھیں اور بعض تابعین سے بیان کریں، پھر اسی زمانہ میں دوسرے بعض تابعین کے سامنے بھول جائیں اور اس کے خلاف فتویٰ دیدیں، بالخصوص جب کہ وہ حدیث بھی کوئی قولی حدیث نہ تھی بلکہ ایک ایسا عمل مستمر جو بزعم مخالفین عہد نبوی سے ابتدائے عہد فاروقی تک برابر ہوتا رہا اور اس کی نسبت یہ تاریخی واقعہ بھی حضرت ابن عباسؓ مشاہدہ کر چکے تھے کہ حضرت عمرؓ نے مجمع میں اس عمل کو بند کردیا تھا، ایسے مستمر عمل اور اس کے تاریخی انسداد کے بھول جانے کا احتمال پیدا کرنا مجیب صاحب ہی کی عقل کا کام ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن القیم وغیرہ نے بھی اس احتمال فاسد کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔

ثانیاً: — یہ احتمال بعید نہ ہو بلکہ علم ناسخ کے برابر ہی ہو تو بھی ہمارا کچھ نقصان نہیں ہے، اس لیے کہ ہم کہیں گے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اپنی حدیث کے خلاف فتویٰ دیا ہے، اور اس مخالفت کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں: ایک یہ کہ حضرت ابن عباسؓ کو اپنی حدیث کا منسوخ ہونا معلوم ہوگیا ہو، اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی حدیث بھول گئے ہوں اور چونکہ یہ دونوں احتمال برابر کے ہیں اس لیے تاوقتیکہ احتمال نسخ کا بطلان ثابت نہ کیا جائے، مجیب صاحب اور ان کے ہم خیال اس سے استدلال واحتجاج نہیں کرسکتے، کہ مجیب صاحب خود آثار ص ۷۰ میں لکھتے ہیں: **إذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال** یعنی جب احتمال پیدا ہوگیا تو استدلال باطل ہوگیا۔

مجیب صاحب نے انھیں دو وجھوں کی تصریح کی ہے۔ اس لیے ہم نے بھی صرف انھیں پر بحث کی ہے، آئندہ اور وجہیں لکھیں گے تو ان کی حقیقت بھی منکشف کردی جائے گی۔

یہاں پہنچ کر ہم کو مجیب صاحب کے امام شوکانی کی اس عبارت کی نسبت بھی کچھ عرض کرنا ہے جس کے ترجمہ میں مجیب صاحب لکھتے ہیں کہ ’’اور یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ راوی نے اس وجہ سے حدیث کو چھوڑ دیا کہ اس کو کوئی ناسخ معلوم ہوگیا ہوگا تو یہ بالکل مہمل بات ہے کیونکہ ہم محتملات پر عمل

کرنے کے مکلّف نہیں، نیز یہ ہوسکتا ہے کہ راوی کسی حدیث کو منسوخ گمان کرتا ہو اور درحقیقت وہ منسوخ نہ ہو'' (آثار ص ۲۸)

میری گذارش یہ ہے کہ مجیب صاحب اور ان کے امام شوکانی ذرا یہ بھی بتادیں تو اچھا ہوگا کہ اخبار آحاد کا کلام نبوی ہونا محتمل ہے یا یقینی۔ اگر فرمائیں کہ یقینی تو یہ عقلاً اور نقلاً باطل ہے، تمام محدثین وفقہاء بصراحت فرماتے ہیں کہ اخبار آحاد ظنی ہیں، اور اگر فرمائیں کہ ان کا کلام نبوی ہونا محتمل ہے، تو بتائیں کہ آپ ان پر عمل کرنے کے مکلّف ہیں یا نہیں، اگر کہیں کہ مکلّف ہیں، تو آپ نے اپنے اس قول کو کہ ''ہم محتملات پر عمل کرنے کے مکلّف نہیں'' خود باطل کردیا، اور اگر کہئے کہ ہم اخبار آحاد پر عمل کرنے کے مکلّف نہیں ہیں، تو پھر یہ ساری بحثیں فضول اور اخبار آحاد سے استدلال واحتجاج غلط ہوجائے گا۔

دوسری گذارش یہ ہے کہ جب آپ کے قول کی بنا پر ''یہ ہوسکتا ہے کہ راوی کسی حدیث کو منسوخ گمان کرتا ہو اور درحقیقت وہ منسوخ نہ ہو'' تو چاہے صحابی کے فعل سے نسخ پر استدلال کیا جائے یا اس کے قول سے، دونوں قول میں یہ احتمال پایا جائے گا، پھر کیا وجہ ہے کہ اصول حدیث میں پوری صراحت کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ بعض اوقات کسی حدیث کا منسوخ ہونا صحابی کے قول سے معلوم ہوتا ہے، کیا اس صورت میں یہ احتمال نہیں ہے کہ صحابی نے اس حدیث کو منسوخ گمان کیا ہو اور درحقیقت منسوخ نہ ہو۔

تیسری گذارش خاص مجیب صاحب سے یہ ہے کہ آپ نے شوکانی کا یہ قول تو نقل کردیا کہ ''ہم محتملات پر عمل کرنے کے مکلّف نہیں''، لیکن یہ خیال نہ کیا کہ جس روایت کو قابل عمل ثابت کرنے کے لیے آپ یہ سب کچھ کررہے ہیں اس کا حدیث ہونا بھی محتملات میں سے ہے، جس پر عمل کرنے کے آپ مکلّف نہیں ہیں، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس روایت میں اس کی تصریح نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تین طلاقوں کو ایک قرار دیا تھا، نہ اس میں یہی تصریح ہے کہ کسی صحابی نے تین کو ایک قرار دیا اور اس کی اطلاع آنحضرت ﷺ کو پہنچی تو آپ نے اس کو برقرار رکھا۔ اور تاوقتیکہ ان میں سے کوئی ایک بات نہ ہو یہ روایت حدیث مرفوع نہیں ہوسکتی، جب آپ کے ہم خیالوں سے یہ کہا جاتا ہے تو وہ اس کے جواب میں کہا کرتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں تین کو ایک قرار دیا جاتا تھا تو اس کی اطلاع آنحضرت ﷺ کو ہوئی ہوگی اور آپ نے برقرار رکھا ہوگا۔ ناظرین اور خود مجیب صاحب انصاف سے بتائیں کہ آں حضرت ﷺ کا مطلع ہونا اور برقرار رکھنا محض احتمالی وادعائی اور

صاف صاف محتملات میں سے ہے یا نہیں، اگر ہے اور یقیناً ہے تو بقول مجیب وشوکانی ہم محتملات پر عمل کرنے کے مکلّف نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ابن حزم جو شوکانی سے کہیں بڑے غیر مقلد ہیں، روایت ابن عباسؓ کو قابل عمل نہیں سمجھتے۔ دیکھو محلی ج ۱۰ ص ۱۶۸

اس بحث کے آخر میں مجیب صاحب نے امام طحاوی کی ایک عبارت بھی لکھی ہے اور اسی کو اس مسئلہ کا مسک الختام قرار دیا ہے، اس عبارت کا ترجمہ بالفاظ مجیب یہ ہے کہ ''یہ ابن عباس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ صلوٰۃ وسطیٰ صلوٰۃ عصر ہے۔ پھر یہ کیسے جائز ہوگا کہ ان کا فتویٰ جو اس حدیث کے خلاف ہے قبول کیا جائے'' اور اس عبارت سے مجیب صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ''طحاوی کے نزدیک راوی کا فتویٰ اگر حدیث کے خلاف ہو تو حدیث لی جائے گی راوی کی رائے نہیں لی جائے گی'' (آثار ص ۳۰)

مجھے مجیب صاحب کی اس بے مائیگی پر رحم آتا ہے، غریب مجیب نے صرف یہ دیکھ کر کہ امام طحاوی نے بھی ایک مقام پر صحابی کی رائے پر اس کی روایت کو ترجیح دی ہے، شور وغل مچانا شروع کر دیا اور یہ نہیں دیکھا کہ امام طحاوی نے یہ کس محل میں فرمایا ہے اور امام شافعی نے کس محل میں صحابی کے فتوے سے اس کی حدیث کے نسخ پر استدلال کیا ہے۔ مجیب صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ نسخ صرف احکام میں ہوا کرتا ہے اخبار میں نسخ کا امکان نہیں ہے، لہٰذا صحابی کے فتوے سے اس کی حدیث کے نسخ کا دعویٰ صرف ان احادیث میں ممکن ہے جو احکامی ہیں، اور جو حدیثیں احکامی نہ ہوں بلکہ اخبار سے تعلق رکھتی ہوں ان میں نسخ کا دعویٰ ممکن نہیں ہے۔ امام طحاوی نے ابن عباس کی جس حدیث کو ان کی رائے پر ترجیح دی ہے وہ حدیث قبیل اخبار سے ہے، یعنی یہ کہنا کہ ''صلوٰۃ وسطی سے مراد صلوٰۃ عصر ہے'' ایک خبر ہے، کوئی حکم (اصولی) نہیں ہے، یہاں پر ایک بات اور بھی سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ حضرت ابن عباسؓ کا قول، قول نبوی کے مناقض نہیں ہے، بلکہ ہوسکتا ہے کہ ابن عباسؓ تفسیر نبوی کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے لغوی حیثیت یا کسی اور جہت سے نماز ظہر کو بھی اس کا مصداق ہوسکنا بیان کرتے ہوں۔ اور اس میں نسخ کا دعویٰ ممکن نہیں ہے، بخلاف امام شافعی کے کہ انھوں نے جس حدیث میں ابن عباسؓ کے فتویٰ سے نسخ کا دعویٰ کیا ہے وہ قبیل احکام سے ہے اور اس میں نسخ کا دعویٰ ممکن ہے۔ پس اگر کسی ایسی حدیث میں جہاں نسخ کا امکان نہ ہو امام طحاوی کے نزدیک راوی کا فتویٰ اس کی حدیث کے مقابلہ میں قابل قبول نہ ہو تو اس سے یہ کسی طرح لازم نہیں آتا کہ جس حدیث میں نسخ کا امکان ہو وہاں بھی راوی کا

فتویٰ اس کی حدیث کے مقابلہ میں نہ لیا جائے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ امام طحاوی نے متعدد احکامی حدیثوں میں راوی (صحابی) کے مخالف فتوے سے اس کی حدیث کے نسخ پر استدلال کیا ہے، جیسا کہ مجیب صاحب آثارص ۲۸ میں اس کو تسلیم کر چکے ہیں۔ لکھتے ہیں ''اور طحاوی تو اس بنا پر کہ راوی نے اپنی روایت کے خلاف کیا حدیث نبوی کو منسوخ کہنے کے بڑے رسیا ہیں۔[1] فوراً حکم لگا دیتے ہیں کہ یہ حدیث منسوخ ہے'' حاصل یہ کہ امام طحاوی کی یہ عبارت امام شافعی کے خلاف نہیں ہے، امام شافعی نے جس محل میں نسخ کا دعویٰ کیا ہے اس قسم کے مقامات میں امام طحاوی ان کی مخالفت نہیں کرتے، اور جس محل میں امام طحاوی نے رائے صحابی کے مقابلہ میں ان کی روایت کو ترجیح دی ہے اس قسم کے مقامات میں امام شافعی یا کوئی محدث وفقیہ نسخ کا دعویٰ نہیں کرتا اور نہ کر سکتا۔ مگر بات یہ ہے کہ ان باتوں کے سمجھنے کے لیے علم کی ضرورت ہے۔

اس طویل و بے معنی تمہید کے بعد مجیب صاحب نے نسخ کے چار جواب دیئے ہیں، مگر چاروں ان کی نادانی و ناواقفیت کے مرہون منت ہیں، چنانچہ پہلا جواب امام طحاوی کے مذکورہ بالا کلام پر مبنی ہے، اور میں بتا چکا ہوں کہ مجیب نے اس سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ غلط ہے، لہٰذا جو جواب اس پر مبنی ہے وہ بھی غلط اور بناء فاسد علی الفاسد اور قیاس مع الفارق کی قبیل سے ہے۔ دوسرے جواب کو مجیب صاحب نے بقاعدۂ مولانا عبدالحی قرار دیا ہے مگر مولانا کی عبارت نقل نہیں کی ہے، ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ عبارت نقل نہ کرنا بے وجہ نہیں ہے ع کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

بہرحال وہ جواب یہ ہے کہ ''ابن عباسؓ کا فتویٰ دو طرح منقول ہے اول یہ کہ ایک مجلس کی

---

(۱) مجیب صاحب مولانا عبدالحی کی ایک عبارت کا ترجمہ کر رہے ہیں اور کثیر الوقوع کا ترجمہ یعنی بڑے رسیا بیان کرتے ہیں۔ مجیب صاحب کے اس حسن ادب کی ہم کوئی داد نہیں دے سکتے، ہاں اتنا عرض کریں گے کہ اگر اس قسم کا لفظ ابن تیمیہ، یا ابن القیم، یا شوکانی کی نسبت ہم لکھ دیتے تو وہ اور ان کے اعوان وانصار چراغ پا ہو جاتے، حالانکہ یہ حضرات باوجود اس جلالت علمی کے جس کے وہ مالک تھے، امام طحاوی کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ اسی قبیل سے مجیب صاحب کے یہ الفاظ بھی ہیں جن کو وہ اس ترجمہ کے بعد بین الہلالین لکھتے ہیں کہ ''لیکن یہ اسی صورت میں ہے جب اپنے مذہب کے خلاف حدیث ہو۔ اور جب اپنے مذہب کے موافق ہو تو یہ ساری نسخ کی فریفتگی کافور ہو جاتی ہے کما سیاتی'' مجیب صاحب کا اشارہ اسی حدیث صلوٰۃ وسطی کی طرف ہے لیکن ناظرین معلوم کر چکے ہیں کہ اس حدیث میں امام طحاوی کا دعویٰ نسخ نہ کرنا اس سبب سے نہیں ہے کہ یہاں حدیث ان کے مذہب کے موافق ہے، بلکہ اس سبب سے ہے کہ یہاں دعویٰ نسخ کا امکان نہیں ہے۔ پس امام طحاوی کی نسبت مجیب صاحب کی یہ شوخ کلامی ان کی نادانی و بے علمی پر مبنی ہے۔ ہاں اگر مجیب صاحب ابن القیم کی نسبت یہ لکھتے تو بہت بجا تھا کہ اپنے مذہب کی مخالف حدیث میں کوئی مجہول راوی آ گیا تو اس کی جہالت کا بہانہ کر کے حدیث کو رد کر دیا۔ لیکن کسی موافق حدیث میں کوئی مجہول راوی پڑ گیا تو چنیں چناں کر کے اس کو چلتا کر دیا اور حدیث کو قابل عمل قرار دے دیا کما مر ۱۲ منہ

تین طلاقیں ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہے۔[۱] دوم ایسی طلاقیں تین طلاقیں واقع ہوں گی۔اور پہلے کی سند دوسرے کی سند سے زیادہ قوی اور زیادہ اصح ہے، پس وہ فتویٰ جس کی سند زیادہ صحیح ہے حدیث کی موافقت کی وجہ سے زیادہ لائق اعتماد ہے۔ نہ وہ فتویٰ جو سنداً کمزور اور حدیث کے مخالف ہونے کی وجہ سے نا قابل التفات ہے پس حدیث ہرگز منسوخ نہیں ہے''(آثار ص۳۰)

میں کہتا ہوں اولاً پہلے فتوے کی سند کو دوسرے کی سند سے زیادہ قوی اور زیادہ اصح، اور دوسرے کی سند کو کمزور بتانا صریح غلط بیانی ہے، اس لیے کہ دوسرا یعنی وقوع ثلاث کا فتویٰ موطا میں مذکور ہے اور موطا کی نسبت حضرت شاہ ولی اللہ محدث نے لکھا ہے: **قال الشافعي: اصح الكتب بعد كتاب الله موطا مالك واتفق اهل الحديث على ان جميع ما فيه صحيح فلاجرم انها صحيحة من هذا الوجه** یعنی امام شافعی نے کہا کہ کتاب اللہ کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب موطا مالک ہے، اور محدثین نے اتفاق کیا ہے کہ اس میں جتنی روایتیں ہیں سب صحیح ہیں، ۲۔ اور اس کے وقوع ثلاث کے فتویٰ کو ابوداؤد نے ابن عباسؓ کے چھ شاگردوں کے واسطہ سے ذکر کیا ہے، ۳- اور اس فتوی کو ذکر کر کے ابوداؤد نے صرف سکوت نہیں بلکہ ایسی تائید کی ہے جو تصحیح سے بڑھ کر ہے، ۴- اور اس لیے کہ اس فتویٰ کی کئی سندیں بخاری و مسلم کی شرط پر ہیں، ۵- اور اس لیے کہ اس فتویٰ کو کسی نے منکر وغیرہ نہیں کہا ہے۔ اور پہلے یعنی ایک قرار دینے والے فتویٰ میں ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔ پس پہلا فتویٰ دوسرے کے مقابلہ میں بالکل ہیچ اور نا قابل التفات ہے۔ اور اس کو دوسرے پر ترجیح دینا بے بصیرتی وتعصب ہے۔

ثانیاً:- حضرت ابن عباسؓ کا فتویٰ ہوسکتا ہے کہ غیر مدخولہ عورت کو بسہ لفظ تین طلاقیں دینے کے باب میں ہو، جیسا کہ اس کے بعض الفاظ سے مترشح[۲] ہوتا ہے۔ پس دونوں فتووں میں تطبیق کی یہ صورت ممکن ہے کہ پہلا غیر مدخولہ کو بسہ لفظ تین طلاقیں دینے کی صورت میں ہے اور دوسرا غیر مدخولہ کو بیک لفظ اور مدخولہ کو بیک لفظ وبسہ الفاظ تین طلاقیں دینے کی صورت میں ہے۔ اور اصول حدیث میں مصرح ہے کہ جب تک جمع وتطبیق ممکن ہوگی ترجیح سے کام نہ لیا جائے گا۔ لہٰذا ان کے دوسرے فتوے کا معارض کوئی

---

(۱) ہکذا فی الاصل ۱۲ منہ

(۲) اور ابن عباسؓ کے غیر مدخولہ کے باب میں تین لفظوں سے ایک واقع ہونا اور ایک لفظ میں تین طلاق دینے سے تین واقع ہونے کی تفصیلی روایت کا ذکر ابن حزم نے محلی میں کیا ہے اس سے بھی اس تطبیق کی تائید ہوتی ہے ۱۲ منہ

فتوی نہیں ہے اور دوسرا فتوی ان کی روایت کردہ حدیث کے خلاف ہے اور جب تک کہ ان کو اپنے حدیث کے نسخ کا علم نہ ہو اس کے خلاف فتوی نہیں دے سکتے، اس لیے ان کی حدیث ضرور منسوخ ہے۔

ثالثاً: – مجیب صاحب نے پہلے فتوے کے اقوی واصح ہونے اور دوسرے کے کمزور ہونے کی کوئی وجہ ذکر نہیں کی، لہٰذا اس بے دلیل دعوے کی بنیاد پر انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ سب مردود ہے، مجھے افسوس ہے کہ مجیب صاحب نے وجہ ذکر کرنے کی ہمت نہیں کی ورنہ ان کی غلط بیانی ونافہمی کی حقیقت اور زیادہ منکشف ہو جاتی۔

نوٹ ان فتووں کی بحث باب سوم میں ہی آئے گی۔

اگلے زمانے کی طالب علمی

دہلی میں ایک زبردست عالم اور خدا پرست بزرگ مولانا شعیب تھے، حضرت عبدالقدوس گنگوہی جیسے حضرات ان کا وعظ سنا کرتے تھے، جہاں ان کا وعظ ہوتا تھا یہ مجال نہ تھی کہ کوئی ادھر سے گذرے اور بے وعظ سنے چلا جائے، چاہے کتنا ہی بھاری بوجھ سر پر لادے ہوئے ہو مگر کھڑا ہو کر ضرور سنتا تھا۔ ان ہی مولانا شعیب کے والد بزرگوار تھے مولانا منہاج۔ یہ لاہور سے طلب علم کی دھن میں دہلی آئے اور بڑی بڑی سختیاں جھیل کر علم کی دولت حاصل کی۔ اس کے بعد سلطان بہلول لودی کے عہد حکومت میں شہر دہلی کے مفتی مقرر ہوئے اور دہلی ہی میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کے واقعات میں مذکور ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں دکان، دکان پھر کر تھوڑا آٹا اور گھی مانگ لاتے۔ آٹے کا چراغ بنا کر اس میں گھی ڈال دیتے اور اسی کی روشنی میں رات بھر مصروف مطالعہ رہتے، جب دن ہوتا تو اسی چراغ کی ٹکیہ پکا کر کھا لیتے اور صرف اتنے ہی پر قناعت کرتے تھے۔ انھوں نے مدتوں تک اسی صورت سے گذر کیا (ص ۲۱۹)۔

کیا ہمارے ان طلبہ کے لیے بھی اس میں کوئی درس عبرت ہے جن کو مدرسہ سے مفت کھانا اور کپڑا، مدرسہ ہی سے پڑھنے کے لیے کتابیں، مدرسہ ہی سے مطالعہ کے لیے بلا قیمت تیل اور رہنے سہنے کے لیے بلا کرایہ دارالاقامہ کا پختہ ہوادار اور آرام دہ کمرہ مل جاتا ہے، باایں ہمہ نہ مطالعہ ہے نہ تکرار، نہ تحصیل علم کا کوئی ولولہ ہے، نہ تہذیب اخلاق کا کوئی اہتمام وفکر۔ (اہل دل کی دل آویز باتیں ص ۲۷)

اعیان الحجاج سے ماخوذ

مشاہیر کرام کے واقعات حج

از: محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ عبداللطیف جامی | آپ محدث ومفسر، اور شیخ طریقت تھے، اپنے مریدوں کے ایک جم غفیر کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوئے، پہلے قسطنطنیہ گئے، سلطان سلیمان خان کا زمانہ تھا، اس نے اور امراء دولت نے آپ کا بڑا اکرام کیا، سلطان کو آپ نے ذکر کی تلقین بھی فرمائی، اس کے بعد حلب ودمشق آئے، اور غالباً ۹۳۹ھ میں آپ نے حج کیا، ۹۶۳ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

امام ابوالحسن بکری صوفی ومحدث | آپ کا نام علی بن محمد تھا، شیخ الاسلام قاضی زکریا کے شاگرد تھے، علوم شریعت، فقہ وحدیث وتفسیر میں متبحر تھے، بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، علم تصوف میں ان کے استاذ شیخ رضی الدین غزی تھے، امام شعرانی کا بیان ہے کہ وہ مصر کے پہلے عالم ہیں، جنھوں نے مصر سے محفّہ (پالکی) میں سفر حج کیا، ان کے بعد اوروں نے بھی کیا۔

شعرانی فرماتے ہیں کہ ایک بار سفر حج میں، میں بھی ان کے ساتھ تھا، میں نے ان سے زیادہ وسیع اخلاق کا انسان نہیں دیکھا، نہ ان سے زیادہ صدقہ دینے والا دیکھا، خواہ علانیہ ہو یا چھپا کر، عموماً دن کو وہ کسی کو کچھ نہ دیتے تھے، اکثر رات میں صدقہ دیتے تھے، ان کی کم سنی کے باوجود عوام وخواص کا ان کی طرف بڑا مرجوعہ تھا، لوگ ان کو قطب قرار دیتے تھے۔

قاہرہ میں ان کی وفات ۹۵۲ھ میں ہوئی۔

ناچیز کہتا ہے کہ شیخ علی متقی ہندی بھی ابوالحسن بکری کے درس حدیث میں شریک ہوئے ہیں، اور ان کی صحبت سے مستفید ہوئے ہیں، شیخ ابوالحسن نے جب علی متقی کی کنز العمال کا مطالعہ کیا تو فرمایا کہ **للسیوطی منةٌ علی العلمین وللمتقی منة علیه** (سیوطی کا احسان سارے لوگوں پر، اور سیوطی پر علی متقی کا احسان ہے) متقی کے علاوہ، ملا علی قاری، اور شیخ ابن حجر مکی وغیرہ بھی ابوالحسن بکری کے تلامذہ میں ہیں۔

سید قطب الدین صفوی ایجی عیسیٰ بن محمد نام تھا، ۹۰۰ھ میں پیدا ہوئے، گجرات میں شیخ ابوالفضل کازوانی کی خدمت میں مختصر ومطول وغیرہ پڑھ کر اجازت حاصل کی، پھر وہیں ابوالفضل استرابادی کے پاس متعدد اسباق کی سماعت کی، اس کے بعد دلی گئے اور علماء کی مجلسوں میں شریک ہوئے، اور بحث ومذاکراہ ہوا، توان کا کمال ظاہر ہوا۔

ابراہیم بن سکندر شاہ نے ان کی بڑی عزت وتکریم کی، اس کے بعد انھوں نے حج کیا، اور چند سال مکہ میں اقامت کی، مدینہ حاضر ہوئے تو وہاں شیخ احمد بن موسیٰ شیشنی کی صحبت اختیار کی، انھوں نے آپ کے سر پر دستار باندھی اور اجازت دی، اس کے بعد دمشق وحلب اور ٹرکی کی سیر وسیاحت کر کے قاہرہ میں مقیم ہوئے، اور وہیں ۹۵۳ھ میں وفات پائی۔

شذرات میں ہے کہ وہ زمانہ کے عجائب میں تھے، وہ سید معین الدین ایجی صاحب تفسیر معینی کے والد تھے۔

شیخ ابن حجر مکی آپ کا نام احمد بن محمد تھا، اقلیم مصر کے محلّہ ابی الہیثم میں ۹۰۹ھ میں پیدا ہوئے، ۹۲۴ھ میں جامع ازہر میں داخل ہوئے، شیخ الاسلام زکریا انصاری، عبدالحق سنباطی اور ابوالحسن بکری وغیرہم سے علوم وفنون حاصل کیے، بیس برس سے کم ہی کی عمر میں ان کو اساتذہ نے درس وافتاء کی اجازت دیدی، اواخر ۹۳۳ھ میں مکہ آئے، اور حج کر کے مجاور حرم ہو گئے، چند دنوں کے بعد مصر واپس آئے اور ۹۳۷ھ میں اہل وعیال کو ساتھ لے کر حج کیا، پھر ۹۴۰ھ میں حج کو آئے تو اس وقت سے مستقل مکہ میں سکونت اختیار کر کے مجاور حرم ہو گئے، اور اطمینان کے ساتھ درس وفتویٰ کے علاوہ تالیف وتصنیف میں مشغول ہوئے۔

ان کی تصنیفات میں صواعق محرقہ، الزواجر، تطہیر الجنان وغیرہ چھپ چکی ہیں، ان کے شاگردوں کی تعداد بے شمار ہے، اس دور میں ان کی شاگردی پر فخر کیا جاتا تھا، وہ شیخ الاسلام خاتمۃ العلماء، اور امام الحرمین کے اونچے القاب سے یاد کیے جاتے تھے۔

ان کے شاگردوں میں علی متقی، ملا علی قاری، اور ہندوستان کے شیخ الاسلام ملا عبدالنبی بھی ہیں، انھوں نے ۹۷۳ھ میں وفات پائی، مکہ میں ان کا مزار ہے۔

شیخ عبدالوہاب شعرانی وہ عالم باعمل، زاہد وفقیہ، محدث واصولی، اور صوفی ومربی تھے، ۹۱۱ھ میں

مصر آکر بڑی جانفشانی سے علوم وفنون میں مہارت پیدا کی، محدثین کی خدمت میں رہ کر علم حدیث میں بھی کمال پیدا کیا، پھر سلوک کی طرف میلان پیدا ہوا اور نہایت سخت سخت مجاہدے کیے۔

برسوں ان کا معمول تھا کہ نہ دن کو لیٹتے تھے نہ رات کو، مسلسل کئی کئی دن روزے رکھتے، اور گدڑی پہنتے تھے، عشا کے بعد ذکر کی مجلس شروع کرتے تھے تو صبح ہی کو ختم کرتے تھے، اس طرح ان کی روحانیت بہت قوی ہوگئی تھی۔

مشائخ طریقت میں علی خواص، مرصفی، اور شناوی کی صحبتوں سے فیضیاب ہوئے، اس کے بعد تصنیف وتالیف میں مشغول ہوئے، ان کی متعدد تالیفات چھپ چکی ہیں۔

وہ نہایت پابند سنت، اور سخت پرہیزگار تھے محتاجوں اور فاقہ مستوں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے، لوگوں کی اذیتیں برداشت کرتے تھے، ان کی خانقاہ میں تقریباً سو اندھے اور معذور جمع ہو گئے تھے، سب کو کھانا کپڑا دیتے تھے، بہت باہیبت وحرمت تھے، امراء ان کے دروازہ پر حاضری دیتے تھے، ان کی خانقاہ سے شب وروز شہد کی مکھیوں کی آواز کی سی آواز آتی رہتی تھی۔

ان کا مقولہ تھا، کہ شریعت جدھر لے چلے ادھر چلو، کشف کے ساتھ نہ چلو، کشف غلط بھی ہوتا ہے، اور فرماتے تھے کہ فقہ کی کتابوں کا مطالعہ بکثرت کرو۔

امام شعرانی نے متعدد حج کیے ہیں، سب سے پہلا حج انھوں نے ۹۱۵ھ میں کیا، پھر ۹۴۷ھ میں بھی اپنے حج کا ذکر انھوں نے کیا ہے، اس سفر میں شیخ علی متقی سے ان کو شرف ملاقات حاصل ہوا ہے، پھر ۹۵۳ھ میں بھی یہ سعادت ان کو ملی ہے، ایک حج میں وہ شیخ ابوالحسن بکری کے ہم سفر تھے۔

وہ حج کے لیے جاتے تھے تو مکہ ومدینہ میں بزرگان دین کی صحبت میں رہنے کا اہتمام کرتے تھے، اپنی کتابوں میں جگہ جگہ انھوں نے حج کے ضمن میں بزرگوں کی صحبت سے فائدہ اٹھانے کا ذکر کیا ہے۔

شیخ شعرانی کی وفات ۹۷۳ھ میں ہوئی۔

خطیب شربینی | محمد بن محمد نام تھا، آپ کا شمار علمائے کبار میں ہے، آپ سے بے شمار لوگوں نے نفع اٹھایا ہے، اہل مصر کا ان کے صلاح وتقویٰ پر اجماع تھا، سب لوگ ان کے علم، زہد وتقویٰ اور کثرتِ عبادت کے مداح تھے۔

ان کی عادت تھی کہ ابتدائے رمضان سے جامع مسجد میں اعتکاف شروع کرتے تھے، تو عید کی نماز کے بعد ہی نکلتے تھے، جب حج کرتے تھے تو جب تک خوب تھک نہ جاتے تھے سواری پر سوار نہیں ہوتے تھے، اور مصر سے روانہ ہوکر جب برکۃ الحاج سے آگے بڑھتے تو وہاں سے راستہ بھر اہل قافلہ کو مناسک حج اور آداب سفر سکھاتے اور نماز کی ترغیب دیتے، اور قصر نماز وغیرہ کی تعلیم دیتے۔

راستہ میں قرآن کی تلاوت بھی بہت کرتے تھے، جب مکہ میں ہوتے تو کثرت سے طواف کرتے، اسی کے ساتھ روزے بھی رکھتے تھے، سفر میں بھی اکثر روزہ رکھتے، نیز کھانے پینے آرام وراحت میں اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے تھے، ان کو گمنامی پسند تھی۔

مختصر یہ کہ وہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے، ۹۷۷ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

مؤلف کہتا ہے کہ مدت ہوئی نولکشور پریس سے تفسیر کی ایک کتاب السراج المنیر شائع ہوئی ہے، اس کے مؤلف بھی خطیب شربینی ہیں، مگر کتاب کے آخر میں ان کا نام محمد بن احمد چھپا ہے، اس لیے تحقیق طلب ہے کہ وہاں غلطی ہوئی ہے، یا شذرات الذہب میں سہو ہوا ہے، یا دونوں کی شخصیتیں جدا جدا ہیں، السراج المنیر کی تالیف سے ۹۶۸ھ میں فراغت ہوئی ہے، اس لیے زمانہ تو وہی ہے جو ہمارے خطیب شربینی کا ہے۔

استاذ اعظم محمد بن ابی الحسن بکری | آپ مشہور محدث وشیخ طریقت ابوالحسن بکری کے صاحبزادے تھے، قاضی زکریا اور اپنے پدر بزرگوار کے شاگرد تھے، ان کو درس واملا میں حیرت انگیز کمال تھا، ان کی تقریر سننے والوں کو صاف محسوس ہوتا تھا کہ ان کا علم کسبی نہیں، وہبی ہے۔

ان کی تقریر نہایت صحیح وفصیح ہوتی تھی، کبھی کوئی غلطی نہیں پکڑی جا سکی، اپنے زمانہ میں وہ بے مثال عالم تھے، ان کا معمول تھا کہ ہر دوسرے سال حج کیا کرتے تھے، ان کی وفات قاہرہ میں ۹۹۳ھ میں ہوئی۔

شیخ احمد بن محمد نہروالی | آپ کا لقب علاء الدین تھا، ۸۷۰ھ میں پیدا ہوئے، نہروالہ (گجرات) میں تحصیل کرنے کے بعد حجاز کا سفر کیا، اور وہیں اقامت کر لی۔

مکہ میں عبدالعزیز نجم الدین عمر سے حدیث کی سند حاصل کی، نہایت صالح ومتقی بزرگ تھے، ان کے لڑکے قطب الدین نہروالی مفتی ومورخ مکہ کا بیان ہے کہ جب تک ہمارے والد کی بینائی

قائم تھی اس وقت تک ان کا برابر یہ معمول تھا کہ دسویں ذی الحجہ کو کنکری مارنے کے بعد فوراً مکہ آ کر حطیم میں خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے بیٹھ جاتے تھے، اور مغرب کی نماز کے وقت تک برابر طواف کرنے والوں کو دیکھا کرتے تھے، مغرب کے بعد طواف زیارت کر کے سعی کرتے، اس کے بعد منیٰ روانہ ہو جاتے۔

فرماتے تھے کہ لازمی طور پر ہر سال اولیاء اللہ حج کو آتے ہوں گے، اور وہ حضرات افضل ہی پر عمل کرتے ہوں گے، یعنی دسویں ہی کو طواف کرتے ہوں گے، اس لیے میں منیٰ سے جلد چلا آتا ہوں اور حطیم میں بیٹھ کر طواف کرنے والوں کو اس امید میں دیکھتا رہتا ہوں کہ شاید کسی ولی پر میری نگاہ یا اس کی نگاہ مجھ پر پڑ جائے اور اس کی برکت مجھے حاصل ہو۔

مفتی قطب الدین کہتے ہیں کہ پھر جب ان کی بینائی جاتی رہی تو ہم لوگ ان کو لے جا کر حطیم میں بٹھا دیتے تھے، وہ فرماتے تھے کہ میں نہیں دیکھ سکتا تو شاید انھیں کی نگاہ مجھ پر پڑ جائے، اور برکت حاصل ہو۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند　　　آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

شیخ کی وفات مکہ میں ۹۴۹ھ میں ہوئی　(نزہۃ)

حافظ سخاوی نے الضوء اللامع میں لکھا ہے کہ احمد نہر والی نے ۸۹۹ھ میں حج کیا اور مجاورت (مکہ کی اقامت) اختیار کی، انھوں نے مجھ سے بخاری و مسلم و شفائے قاضی عیاض اور دوسری کئی کتابیں پڑھیں، میں نے ان کو بہت لمبی سند لکھ کر دی، شیخ احمد سند لے کر ہندوستان چلے آئے تھے، اس کے بعد پھر مکہ گئے تو وہیں کے ہو رہے۔

شیخ قطب الدین نہر والی مفتی مکہ آپ کا نام محمد بن احمد تھا، شیخ احمد نہر والی کے صاحبزادہ تھے، ۹۱۷ھ میں پیدا ہوئے اپنے والد سے تحصیل علم کے بعد مکہ گئے، اور وہاں محبّ الدین احمد نویری اور محدث یمن عبد الرحمٰن ابن الدیبع سے حدیثوں کی سماعت کی، ۹۴۳ھ میں مصر جا کر علم حاصل کیا، قاضی شوکانی نے البدر الطالع میں ان کی بڑی مدح سرائی کی ہے، لکھا ہے کہ وہ اشراف (حکام) مکہ کی طرف سے انشاء لکھا کرتے تھے، ترکوں میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی، ترکی حکومت کے امراء و اکابر میں سے جو کوئی حج کے لیے آتا تھا اس کو یہی طواف کرایا کرتے تھے، ان کے سوا کسی کو وہ لوگ پسند نہیں

کرتے تھے، ترکی لوگ بڑے بڑے نذرانے پیش کرتے تھے، یہ ان رقموں سے عمدہ عمدہ قیمتی کتابیں خریدتے تھے، اور ضرورت مندوں کو دیتے تھے۔

ان کو سیر وتفریح کا بھی بہت شوق تھا، طائف بہت جاتے تھے اور اپنے ساتھ علماء، ادباء کی ایک جماعت کو بھی لے جاتے تھے اور سب کے مصارف خود برداشت کرتے تھے۔

احمد شاہ گجراتی نے جو مدرسہ مکہ میں قائم کیا تھا اس کے متولی یہی تھے، دوبار قسطنطنیہ گئے، دوسری مرتبہ ۹۶۵ھ میں وہاں گئے تو سلطان سلیمان خاں نے ان کو خلعت شاہانہ عطا کی، سلیمان خاں نے مکہ میں سلیمانیہ نام کے چار مدرسے چاروں مذہبوں کے لیے قائم کیے، تو مدرسہ حنفیہ سلیمانیہ کو ان کے حوالہ کیا، اور پچاس عثمانی یومیہ ان کا وظیفہ مقرر کیا۔

سلطان مراد خاں نے ان کو مفتی مکہ کا عہدہ سپرد کیا، اور یومیہ پچاس عثمانی اس نے بھی وظیفہ مقرر کیا، نیز حرم کا خطیب بھی انھیں کو نامزد کیا، اور خطابت کے صلہ میں یومیہ مزید چالیس عثمانی مقرر ہوئی، پھر سلطان مراد خاں نے صفا پر مدرسہ عثمانیہ قائم کیا، اور اس میں تدریس کا عہدہ ان کو سپرد ہوا تو پھر یومیہ پچاس عثمانی کا وظیفہ مقرر ہوا۔

حاصل یہ کہ حکومت ٹرکی میں ان کا بڑا اعزاز تھا، سلطان مراد ان کی باتوں کو رد نہ کرتا تھا، ان کی بہترین تصنیف **الإعلام بأعلام بيت الله الحرام** ہے جو مصر میں طبع ہو چکی ہے۔

ترکوں نے جب یمن فتح کیا، تو ایک کتاب **البرق اليماني في الفتح العثماني** بھی انھوں نے لکھی ہے۔ صاحب شذرات الذہب نے مفتی قطب الدین کو **الإمام العلامة** کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔

مفتی صاحب کی وفات مکہ میں ۹۹۰ھ میں ہوئی۔

شیخ علم الدین حاجی آپ تارک الدنیا، اور علائق سے مجرد تھے، اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے، جب مکہ معظّمہ کے لیے روانہ ہوتے تو ایک ہانسی ایک تیشہ ساتھ لے لیتے اور راستہ میں جنگل کی لکڑیاں اور گھاس کاٹ کر فروخت کر کر کے کھاتے، کسی سے بھیک نہ مانگتے، نہ نذر قبول کرتے، اپنے کو بزرگ ظاہر نہیں کرتے، عوام کی طرح رہتے سہتے تھے۔

ملا محمد نارنولی کا بیان ہے کہ میرے دادا، اور شیخ صدر الدین کھر دلی اور شیخ علم الدین، ایک

ساتھ حج کے لیے نکلے، جب سمندر کے ساحل پر پہنچے تو جہاز والوں نے تفتیش شروع کی کہ کوئی اپنے ایسے خویش وقریب کو چھوڑ کر تو نہیں آیا ہے، جو اس کی خدمت کا محتاج ہو، کوئی ایسا ہو تو جا کر اس کی خدمت کرے۔

شیخ علم الدین اپنی کمر سے ہانسی اور تیشہ باندھے ہوئے تھے، ان کو ہلا کر کہا کہ میرے خویش واقارب بس یہی ہیں، جہاز والے مسکرائے اور ان کو کشتی میں بٹھالیا۔ باقی دو حضرات واپس چلے آئے۔

آپ کا مزار شہر نارنول کے باہر ہے۔ (اخبار الاخیار)

شیخ حاجی عبدالوہاب بخاری آپ سید جلال بزرگ کی اولاد میں تھے، بڑے بزرگ اور علم وعمل میں ممتاز تھے، ایک دن ملتان میں اپنے استاذ وخسر سید صدرالدین بخاری کی خدمت میں حاضر تھے کہ سید نے فرمایا کہ دنیا میں اب بھی خدائے تعالیٰ کی ایسی دو نعمتیں موجود ہیں جو تمام نعمتوں سے بالا تر ہیں، مگر لوگ ان کی قدر نہیں پہچانتے، ایک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک جو بصفت حیات مدینہ منورہ میں موجود ہے، دوسرے قرآن پاک جو بعینہ حق تعالیٰ کا کلام ہے، حاجی عبدالوہاب اس نکتہ کو سنتے ہی اٹھے، اور پیر سے زیارت مدینہ کی رخصت حاصل کر کے خشکی کے راستہ سے روانہ ہو گئے اور یہ سعادت عظمیٰ حاصل کر کے وطن لوٹے۔

سکندر لودھی کے زمانہ میں وہ ملتان سے دہلی آئے، سلطان سکندر کو ان سے اعتقاد پیدا ہوا اور ان کی تعظیم وتکریم میں اس نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

حاجی عبدالوہاب دوسری بار دہلی سے حرمین کی زیارت کے لیے گئے اور یہ سعادت مکرر حاصل کی۔ شیخ کی وفات دہلی میں ۹۳۲ھ میں ہوئی۔

شیخ عبدالنبی گنگوہی شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے تھے، جوانی میں حرمین کی زیارت کا شرف حاصل کیا، شیخ عبدالحق فرماتے ہیں کہ بعض فقہائے مکہ کے پاس کچھ حدیث نبوی پڑھی، بعض فقہائے مکہ سے مراد ابن حجر مکی ہیں، جیسا کہ دوسرے تذکروں میں اس کی تصریح موجود ہے۔

حج سے واپسی کے بعد اباحت سماع کے مسئلہ میں ان کا اپنے والد شیخ رکن الدین سے اختلاف ہو گیا، جس سے ان کی بڑی شہرت ہوئی، اس زمانہ میں اکبر کو ایک صدر کی تلاش تھی، جو علم

ودیانت کے ساتھ متصف ہو۔

چنانچہ ۹۷۱ھ میں ان کو مسند صدارت تفویض ہوئی، اور حد سے زیادہ جاہ وجلال اور رسوخ واعتبار ان کو حاصل ہوا۔ اکبر ان کا بے حد معتقد تھا، حدیث سننے کے لیے خود ان کے گھر پر آتا تھا، اور ان کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا، مگر چند برسوں کے بعد زمانہ نے کروٹ بدلی، اور بادشاہ کا مزاج ان سے برہم ہوگیا۔

اکبر کے مزاج کو ان سے برہم کرنے میں ابوالفضل اور فیضی کا ہاتھ تھا، چنانچہ ان کے معاصر مورخ بدایونی نے لکھا ہے کہ ایک شخص جو شرعاً گردن زدنی تھا، اس کے قتل کا حکم صادر کرنے پر ان لوگوں نے اکبر کو شیخ عبدالنبی سے برگشتہ کر دیا، تا آنکہ ۹۸۶ھ میں ان کو صدارت سے معزول کر کے مولانا عبداللہ سلطان پوری مخدوم الملک کے ساتھ مکہ روانہ کر دیا۔

مکہ سے واپسی کے بعد مخدوم الملک تو گجرات پہنچ کر ۹۹۱ھ میں انتقال کر گئے، اور شیخ عبدالنبی دہلی آئے اور جیل خانہ بھیج دیے گئے، جیل خانہ ہی میں ۹۹۲ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

شیخ عبدالنبی نے کئی تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں، ازانجملہ سنن الہدیٰ ان کی بہترین تصنیف ہے جو شیخ عبدالحق کے مطالعہ میں بھی رہی ہے، اسی طرح ان کی ایک کتاب وظائف النبی بھی اچھی کتاب ہے۔

افسوس ہے کہ ان میں سے اب تک کوئی طبع نہیں ہوئی، مولانا عبدالحی رائے بریلوی نے شیخ عبدالنبی کی حمایت سنت اور مخالفت بدعت کی تعریف کی ہے (ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج۴ ص۲۲۰)

شیخ جمالی ان کا اصل نام جلال خاں تھا، جمالی ان کا تخلص ہے، مولانا سماء الدین دہلوی کے مرید تھے، انھوں نے سیاحت بہت کی تھی، حرمین شریفین کی زیارت سے بھی بہرہ اندوز ہوئے، علامہ دوانی اور مولانا جامی کی زیارت بھی کی تھی۔ شاعری میں کمال حاصل تھا، نعت میں ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے، اور بعض صلحاء نے خواب میں دیکھا تھا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند فرمایا ہے ؎

موسیٰ زہوش رفت بیک پر تو صفات — تو عین ذات می نگری در تبسمی

شیخ جمالی کی وفات ۹۴۲ھ میں ہوئی، ان کے بڑے بیٹے شیخ گدائی نے بھی اہل وعیال

سمیت زیارت حرمین کی سعادت حاصل کی تھی، ان کی وفات ۹۷۶ھ میں ہوئی۔

سید رفیع الدین صفوی حسبی ونسبی فضائل سے آراستہ تھے، ان کے آباء واجداد عالم وصالح ومتقی تھے، میر معین الدین صفوی صاحب تفسیر معینی ان کے اجداد میں تھے۔

سید رفیع الدین بڑے اونچے درجہ کے عالم ومحدث تھے، معقولات میں دوانی کے شاگرد تھے، دوانی چونکہ ان کے خاندان کے شاگرد تھے، اس لیے ان کے گھر آکر ان کو پڑھاتے تھے، سید رفیع الدین حدیث میں حافظ سخاوی کے شاگرد تھے۔

کہا جاتا ہے کہ شیخ سخاوی نے قبل اس کے کہ سید رفیع الدین ان کی خدمت میں پہنچیں، پچاس سے زائد کتابوں کی سند لکھ کر ان کے پاس بھیج دی تھی، اس کے بعد وہ حاضر خدمت ہوئے اور ایک مدت مدید تک ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور مشافہۃً ان سے حدیثیں سنیں۔ سید رفیع الدین شیراز میں پیدا ہوئے، اور سلطان سکندر لودھی کے زمانہ میں گجرات ہوتے ہوئے دہلی آئے۔ سلطان ان کا بہت گرویدہ ہوا، پھر اس کی اجازت سے انھوں نے آگرہ میں سکونت اختیار کی، مزار بھی وہیں ہے، ۹۵۴ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

میر سید عبدالاول جونپوری تمام علوم عقلیہ ونقلیہ میں ماہر تھے، ان کا خاندانی وطن زید پور تھا، ان کی پیدائش دکن میں ہوئی اور وہیں تحصیل علم سے فارغ ہو کر نام پیدا کیا، پھر گجرات آئے، اور وہاں سے حرمین شریفین کی زیارت کے لیے گئے، وہاں سے لوٹ کر احمد آباد آئے، آخر میں خان خانان محمد بیرم خاں (جو بقول محدث دہلوی درویشوں کی محبت اور علماء وفضلاء کی تربیت وقدر ومنزلت میں دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا) کے اصرار سے دہلی آئے اور دو برس زندہ رہ کر ۹۶۸ھ میں رہگزائے عالم آخرت ہوئے، آپ کی یادگار بخاری کی ایک شرح ہے، جس کا نام ''فیض الباری'' ہے سیرت پر فارسی زبان میں آپ کا ایک مختصر رسالہ بھی میں نے دیکھا ہے۔

ارشاد الثقلین

بجواب اتحاد الفریقین

محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ

(پانچویں قسط)

حضرت معاویہؓ کے حق میں دریدہ دہنی

اس کے بعد مصنف ''اتحاد الفریقین'' نے خواہ مخواہ حضرت معاویہؓ پر بے حد کمینہ حملے کیے ہیں اور غایت دناءت سے ان کی صحت نسب اور حضرت ہند والدۂ حضرت معاویہؓ کی پاکدامنی میں کلام کیا ہے، اور لطف یہ ہے کہ اس کے لیے اہل سنت کی کسی معتبر کتاب کا حوالہ نہیں دیا ہے، بلکہ سبط ابن الجوزی اور جاحظ وغیرہ کا حوالہ دیا ہے اور اس کا کچھ لحاظ نہیں کیا کہ اول الذکر کے تشیع بلکہ ترفض کی شکایت اجلۂ علمائے اہل سنت نے کی ہے (دیکھو لسان المیزان) اور جاحظ کی لامذہبیت ساری علمی دنیا میں مشہور ہے، اور نہج البلاغۃ میں سید رضی (شیعہ) کے تصرفات بے جا کے خود شیعہ شارحین بھی شاکی ہیں، پس ایسے حوالہ جات سے اہل سنت کے مقابلہ میں استدلال کرنا سخت جہالت ہے۔

اہل سنت کی صدہا معتبر و مستند کتابوں میں حضرت معاویہؓ اور حضرت ہندؓ کے حالات پوری تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں، لیکن ان حملوں کا کوئی اشارہ بھی ان میں موجود نہیں ہے، جو شیعہ مصنف نے ان پر کیے ہیں، کامل بن اثیر، تاریخ الخلفاء، اسد الغابہ، استیعاب، اصابہ بلکہ مسعودی (شیعہ) کی مروج الذہب کے مطالعے سے میرے بیان کی تصدیق ہوسکتی ہے، بلکہ شیعہ مصنف کے ادعائے باطل کے برخلاف اہل سنت کی صحیح احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ہندؓ کا دامن عزت شیعہ مصنف کے جھوٹے سے الزام سے یکسر پاک تھا۔

متعدد کتب احادیث میں یہ حدیث مذکور ہے کہ ہند سے جب بیعت لی گئی ہے تو جیسا کہ تمام عورتوں سے یہ عہد لیا جاتا تھا کہ ''زنا نہ کرنا'' ان سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو انھوں نے فوراً کہا کہ یارسول اللہ کیا کسی شریف عورت سے اس بے حیائی کا ارتکاب ممکن بھی ہے؟

بیعت کا واقعہ ائمہ شیعہ کی مخصوص تعلیم کی طرح کوئی مخفی کارروائی نہ تھی، اگر حضرت ہندؓ کا دامن مذکورۂ بالا الزام سے ملوث ہوتا تو کہنے والے فوراً یہ کہہ دیتے کہ کم از کم آپ کو یہ سوال زیب نہیں دیتا، مگر ایسا نہیں ہوا اس لیے یہ ایک زبردست شہادت ہے کہ حضرت ہندؓ نے حالت کفر میں اسلام کی چاہے جتنی مخالفت بھی کی ہے، لیکن عصمت وعفاف کے خلاف کوئی حرکت ان سے سرزد نہیں ہوئی تھی۔

ایک لطیفہ: - آپ کو یاد ہوگا ابھی ابھی مصنف اتحاد الفریقین نے لکھا تھا کہ زعــم کا لفظ عربی زبان میں اس وقت بولا جاتا ہے، جب کہ کسی کے مقولہ کا باطل وکاذب ہونا، متکلم بیان کرنا چاہتا ہو، لیکن اس بحث میں جب یہی لفظ ایک عبارت میں آیا تو مصنف اتحاد لفظ زعم کا معنی بھول گئے، اوریزعمون کا ترجمہ ''گمان کرتے ہیں'' لکھ ڈالا، حالانکہ ان کی تحقیق کی بنا پر اس کا ترجمہ یہ ہونا چاہئے کہ ''ان کا باطل اور جھوٹا خیال یہ ہے''۔

سچ ہے دروغ گورا حافظہ نباشد

حضرت علیؓ اور اہل شام کا دینی ومذہبی اتحاد:

نہج البلاغۃ جلد دوم ص ۱۱۸ میں حضرت علیؓ کا ایک گشتی فرمان منقول ہے، جس کی عبارت یہ ہے:

وكان بدء امرنا أنا التقينا والقوم من أهل الشام والظاهر أن ربنا واحد ونبينا واحد ودعوتنا فى الاسلام واحد لا نستزيدهم فى الايمان بالله والتصديق برسوله صلى الله عليه واله ولا يستزيدوننا دينا فالأمر واحد الاما اختلفنا فيه

اور ابتدا ہمارے واقعات کی یہ ہوئی کہ ہم میں اور اہل شام میں جنگ ہوئی اور ظاہر ہے کہ ہمارا اور ان کا رب ایک اور ہمارا اور ان کا نبی ایک اور ہماری ان کی دعوت اسلام میں ایک ہے، نہ ہم ایمان باللہ اور تصدیق بالرسول میں ان سے زیادہ اور نہ وہ ہم سے زیادہ، پس معاملہ ہمارا اور ان کا ایک ہے، صرف خون عثمان کے بارے

من دم عثمان ونحن منه براء.   میں ہمارا اوران کا اختلاف پڑ گیا تھا، حالانکہ خدا کی قسم میں اس سے بالکل پاک وصاف ہوں۔

''ابوالائمہ کی تعلیم''میں اس گشتی فرمان کونقل کر کے بتایا گیا تھا کہ اس فرمان سے روز روشن کی طرح واضح ہو گیا، کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ وغیرہ اہل شام میں کوئی دینی و مذہبی اختلاف نہ تھا، اگر ان میں کوئی اختلاف تھا تو وہ صرف خون عثمانؓ کے معاملہ میں، پس حضرت معاویہؓ وغیرہ کے متعلق وہ ناپاک خیالات رکھنا جن کی مذہب شیعہ تعلیم دیتا ہے حضرت علیؓ سے بغاوت ہے۔

مصنف اتحاد الفریقین نے اپنے رافضیانہ جذبات کے ماتحت اس فرمان میں بھی تصرف کرنے کی کوشش کی ہے، اور چالاکی سے اصل عبارت اس فرمان کی نقل نہیں کی تاکہ ان کی فریب کاری کا راز فاش نہ ہونے پائے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے''اس میں حضرت علی نے .... یہ بتایا ہے کہ بظاہر اہل شام ہماری طرح کلمہ شہادتین وغیرہ کا اظہار کرتے تھے ......یعنی ظاہر میں وہ اور ہم متحد معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے افعال اور ان کا طرز عمل اسی خون عثمان کے متعلق بالکل واضح ہے کہ امام برحق پر ناحق خروج کیا''۔(ص۳۰)

شیعہ مصنف سے گذارش ہے کہ یہ آپ اپنے خیالات بیان کر رہے ہیں کہ حضرت علیؓ کے؟ اگر یہ آپ کے خیالات ہیں تو ہم کو آپ کے خیالات سے کچھ سروکار نہیں، ہم تو حضرت علی کے خیالات بیان کر رہے ہیں؛ اور اگر حضرت علی کے خیالات آپ بیان کر رہے ہیں تو فرمان مذکور میں تو یہ ہرگز نہیں ہے، فرمان مذکور ہر شخص آنکھ والے کے سامنے بالفاظہ تقریباً ترجمہ لفظی کے ساتھ موجود ہے، ہر شخص بچشم خود دیکھ سکتا ہے کہ آپ کے خیالات کا کوئی اشارہ اس میں موجود نہیں ہے، آپ کہتے ہیں کہ حضرت علی اپنا اور شامیوں کا متحد ہونا صرف ظاہری طور پر بتاتے ہیں، حالانکہ حضرت علی کے الفاظ میں اس کی تصریح ہے کہ ہم دونوں کے خدا اور نبی اور اسلامی دعوت کا اتحاد بالکل کھلا ہوا اور ظاہر ہے، کسی سے پوشیدہ نہیں ہے، اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ ہم دونوں کامل الایمان اور تصدیق رسالت میں مساوی ہیں، ان دونوں باتوں میں نہ وہ ہم سے کسی زیادتی کے طلب گار ہیں نہ ہم ان سے۔

اگر آپ کے خیال باطل کے مطابق حضرت علیؓ کا یہ منشا ہوتا کہ ظاہر میں ہم دونوں متحد ہیں

لیکن باطن میں ہمارے ان کے درمیان بڑا زبردست دینی و مذہبی اختلاف ہے، تو حضرت نے اس اختلاف کو کیوں ظاہر نہیں فرمایا اور ان کا آخر میں یہ فرمانا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے کہ **فالأمر واحد** (پس ہمارا اور ان کا معاملہ ایک ہے) یہاں تو الظاہر کا لفظ بھی موجود نہیں ہے۔

اس کے بعد آپ نے کنز العمال سے حضرت علیؓ کا یہ مقولہ نقل کیا ہے: **من سوی بیننا وبین عدونا فلیس منا** یعنی جو ہم کو اور ہمارے دشمن کو برابر کہے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اس کے متعلق گذارش ہے کہ اول تو اس قول کی سند اور اس کی صحت پیش کیجئے۔

ثانی: -اگر یہ قول بھی ہے تو ہم کو مضر نہیں، اس لیے کہ ہم حضرت علیؓ اور ان کے مقابلہ میں لڑنے والے دونوں کو مسلمان سمجھتے ہیں، بایں ہمہ حضرت علیؓ کو ان کے طرف مقابل (یعنی حضرت معاویہؓ وطلحہؓ وزبیرؓ) سے بدرجہا افضل اعتقاد کرتے ہیں، لہذا ہم نے دونوں کو برابر نہیں سمجھا۔

اس کے بعد شیعہ مصنف نے پہلے دعوی کا دوسرا جزء اس عنوان سے ذکر کیا ہے۔

جناب امیرؓ کا تلوار نہ اٹھانا

اس عنوان کے ماتحت لکھتے ہیں ''فرقۂ شیعہ کا عقیدہ ہے کہ خلفائے ثلٰثہؓ کے زمانہ میں حضرت علیؓ اور دیگر اصحاب اخیارؓ نے بوجوہ ذیل تلوار نہیں اٹھائی، حضرات اہل سنت و جماعت بھی ان وجوہ میں متحد ہیں''۔

اور اس کے بعد پہلی وجہ کے ثبوت میں کنز العمال سے یہ حدیث نقل کی ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے علیؓ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب لوگ آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی طرف رغبت کریں گے اور مال وراثت کو جمع کر کے کھائیں گے اور مال کو بہت زیادہ محبوب رکھیں گے اور دین خدا کو مکر وفریب کا آلۂ کار بنائیں گے اور خدا کا مال آپس میں تقسیم کر لیں گے۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا، میں ان کو مع ان کے پسندیدہ امور کے ان کی حالت پر چھوڑ دوں گا، اور میں خدائے عز وجل اور اس کے رسولؐ اور آخرت کو پسند کروں گا اور دنیاوی مصائب وآلام پر صبر کروں گا یہاں تک کہ بعد موت آپ کی خدمت میں پہنچوں، آنحضرتؐ نے فرمایا اے علیؓ تم نے بہت ٹھیک کہا، یا اللہ تو علیؓ کو اسی طرح کر دے''

مجھے مصنف ''اتحاد الفریقین'' کی خوش فہمی پر بے انتہا حیرت ہے، نہ معلوم انھوں نے اس حدیث کے کس لفظ سے یہ مطلب نکالا ہے کہ:

''اے علیؓ خلفائے ثلٰثہؓ کے زمانہ میں تلوار نہ اٹھانا''۔

حدیث کنزالعمال کا بجنسہ وہی ترجمہ آپ کے سامنے ہے جو شیعہ مصنف نے کیا ہے، آپ خود دیکھئے کہ اس میں نہ خلافت کا نام آیا ہے نہ خلفا کا، نہ کسی زمانہ کی تعیین ہے، نیز اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی وصیت بھی مذکور نہیں ہے، بلکہ آنحضرتؐ کے ایک سوال کا جواب حضرت علیؓ نے دیا ہے اور آنحضرتؐ نے اس کی تقویت فرمائی ہے، پس اس کو اس خانہ ساز وصیت کی تائید وموافقت میں پیش کرنا جو کافی سے آگے نقل کی جائے گی، شیعوں ہی کی عقل کا کام ہوسکتا ہے۔

اگر مصنف اتحاد یہ کہیں کہ (حدیث کنزالعمال میں اگرچہ خلفاءؓ کا نام نہیں اور نہ زمانہ کی تعیین ہے لیکن جو امور اس میں مذکور ہیں وہ خلفائے ثلٰثہؓ کے عہد میں واقع ہوئے، اس سے معلوم ہوا کہ اسی زمانہ کے متعلق یہ سوال وجواب ہوا تھا۔

تو جواب اس کا یہ ہے کہ یہ قطعاً جھوٹ ہے، خلفائے ثلٰثہؓ کا زہد وتقشّف، دینداری وپرہیزگاری، تقسیم غنائم میں مساوات واتباع شریعت کا لحاظ اور تمام اوامر ونواہی شریعت کی پابندی ایسی مشہور ہے کہ ان کے شدید ترین دشمن ومخالف بھی ان باتوں کے اعتراف پر مجبور ہوئے، علامہ ابن میسم بحرانی شرح نہج البلاغۃ میں رقم طراز ہیں کہ:

والفرق بین الخلفاء الثلٰثة وبین معاویة فی اقامة حدود اللّٰه والعمل بمقتضی اوامره ونواهیه ظاهر. یعنی حدود شریعت کے قائم کرنے اور خدا کے اوامر ونواہی پر عمل کرنے کے باب میں حضرات خلفائے ثلٰثہؓ اور معاویہؓ میں کھلا ہوا فرق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خلفائے ثلٰثہؓ حدود شریعت کو قائم رکھنے والے اور اوامر ونواہی پر پورے عامل تھے۔ اور ملا عبداللہ مشہدی، شیعہ، نے لکھا ہے:

''وجمع کہ متصدق خلافت وریاست شدند، دریں امور کد وکوشش سجدے نمودند تا درنظر خلائق از استحقاق امر خلافت درنیفتند وبسیارے از یں مردم در مالیات ودراجتناب از محرمات ظاہرہ بلکہ درترک بعض لذائذ مباحۃ نیز بہ برکت دریافت صحبت شریف نبویؐ وبقاء

آں برکات از جہتہ قرب زمان از اہل ورع وزہد وتقویٰ بودند''۔

اس عبارت میں ملا مشہدی نے صاف تصریح کردی ہے کہ کفار سے جہاد''اور مانعین زکوٰۃ''
مرتدین کے ساتھ قتال اور مدعیان نبوت کے مقابلہ اور دیگر امور شریعت کی پابندی میں خلفاءؓ نے
انتہائی کوشش کی اور مالی معاملات اور محرمات ظاہری سے بلکہ مباح لذتوں سے بہ برکت صحبت نبویؐ
ایک دم الگ تھلگ تھے اور وہ لوگ اہل ورع صاحب زہد وتقویٰ تھے۔

اور علامہ شریف مرتضٰی نے تنزیہ الانبیاء والائمۃ میں لکھا ہے۔

''**ان عمرؓ کان مظهر الاسلام والتمسک بالشرائع کلها** یعنی حضرت عمرؓ اسلام
کو ظاہر کرنے والے اور تمام احکام شریعت محمدیہؐ کے پابند تھے''

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود حضرت علیؓ نے ان حضرات کی پابندی شریعت واتباع سنت اور
زہد وتقویٰ کی مدح سرائی کی ہے، نہج البلاغۃ کے مشہور ومعروف خطبہ **لله بلاد فلان** الخ، کی شرح میں
میر فتح اللہ کاشانی نے لکھا ہے کہ اس سے حضرت عمرؓ مراد ہیں۔

بہر حال حدیث کنز العمال میں جو امور مذکور ہیں وہ خلفائے ثلٰثہؓ میں باتفاق فریقین نہیں
پائے جاتے، ہاں نہج البلاغۃ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اوصاف حضرت علیؓ کے عمال حکومت
اور ان کے لشکریوں اور شیعوں میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ پس یقیناً اس حدیث کے مصداق وہی لوگ
ہیں۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں چند عبارتیں نہج البلاغۃ کی غایت اختصار کے بعد پیش کی جاتی ہیں، نہج
البلاغۃ مطبوعہ مصر قسم اول صفحہ ۲۶۵ میں ہے:

قد أصبحتهم في زمن لا يزداد الخير فيه إلا إدباراً والشر فيه إلا إقبالاً والشيطان في هلاک الناس الا طمعاً فهذا أوان قويت عدته وعمت مكيدته وأمكنت فريسته.

تم ایسے زمانہ میں ہو کہ بھلائی پیٹھ پھیرے جارہی ہے اور برائی بڑھتی جارہی ہے اور شیطان آدمیوں کی ہلاکت کی اور زیادہ طمع کیے جارہا ہے پس یہ وقت ہے کہ شیطان کا ساز وسامان مضبوط اور اس کا مکر عام اور اس کا شکار قابو میں آگیا ہے۔

اور اس کے بعد فرمایا کہ:''نظر اٹھا کر دیکھو کہ تم کو سوائے اس کے کچھ نہ نظر آئے گا کہ کوئی

فقیر ہے جو اپنے فقر میں پریشان ہے، اور کوئی دولتمند ہے جو اللہ کے انعام کے بدلہ میں کفر کر رہا ہے، اور بخیل ہے جو اللہ کے حقوق میں بخل کر رہا ہے اور کوئی سرکش ہے کہ گویا نصیحتوں کے سننے سے اس کا کان بھرا ہے، اب نیکوکار اور صالح لوگ کہاں رہے؟ اور اپنی کمائیوں میں حرام وحلال کا لحاظ رکھنے والے کہاں ہیں؟ اور وہ سب اس دنیا سے چلے گئے، تم تو آدمیوں کے ایسے ردی اور ناکارہ گروہ میں پیدا ہوئے ہو، جن کی حقارت وذلت کی وجہ سے ان کی برائی بھی لب پر لائی نہیں جاتی، فساد بالکل آشکارا ہو گیا، پس نہ کوئی برائی روکی جاتی ہے نہ کوئی روکنے والا خود رکتا''۔

پھر صفحہ ۲۷۱ میں بھی اپنے اصحاب کی دنیا پرستی ونفاق پسندی کا ماتم کیا ہے اور صفحہ ۲۰۴ میں نہایت تنگ آ کر ارشاد فرمایا ہے کہ دوسری قومیں تو اپنے حاکموں کے ظلم وستم سے ڈرتی ہیں اور میں اپنی رعیت کے ظلم وستم سے ڈرتا ہوں۔

استنفرتكم للجهاد فلم تنفروا وأسمعتكم فلم تسمعوا، ودعوتكم سراً وجهراً فلم تستجيبوا ونصحت لكم فلم تقبلو.

یعنی میں نے جہاد کے لیے تم کو گھروں سے نکالا تو تم نہیں نکلے، میں نے تم سے کہا سنو تو تم نے نہیں سنا، میں نے تم کو خفیہ وعلانیہ دعوت دی تو تم نے لبیک نہیں کہا، اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی تو تم نے قبول نہیں کیا''۔

اور صفحہ ۸۲ وصفحہ ۸۳ میں اپنے اصحاب کی سخت شکایت کی ہے، ان کو بے علم، ناپرہیزگار اور ناحق کا لالچی فرمایا ہے اور صفحہ ۹۱ وصفحہ ۹۲ میں بھی یہ مضمون ہے، اور صفحہ ۲۴۷ میں ہے:

ولـكنكم نسيتم ماذكرتم وامنتم مـا حـذرتـم فتـاه عـنكم رأيكم وتشتَّت عليكم أمركم ولوددت ان الله فرق بيني وبينكم.

یعنی تم کو جو نصیحت کی گئی تھی اس کو تم بھلا بیٹھے اور جس چیز سے تم ڈرائے گئے اس سے بے خوف ہو گئے پس تمہاری عقل چکرا گئی اور تمہارا کام پراگندہ ہو گیا اور میں تو تمنا کرتا ہوں کہ اللہ مجھ سے اور تم سے جدائی پیدا کرا دے۔

اور صفحہ ۲۴۸ میں فرماتے ہیں:

فـلا امـوال بذلتموها للذى رزقها ولا

یعنی نہ تو تم نے مال ودولت دینے والے خدا

تحریر: حمد محمد العریان ترجمہ: مولانا ازہر رشید الاعظمی، شارجہ

یزید بن معاویہ کے حالاتِ زندگی

(۶۰ھ-۶۴ھ)

(تیسری قسط)

خلافتِ یزید اور اس پر مسلمانوں کی بیعت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں یزید بن ابی سفیان کے انتقال کے بعد ان کے بھائی معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو شام کے ایک چوتھائی علاقے کا گورنر مقرر کیا تھا، شام اس وقت چار حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک چوتھائی حصہ فلسطین کا علاقہ تھا، جس کا رقبہ بیت المقدس سے اردن کی ''شریعہ'' نامی نہر تک تھا۔

دوسرا چوتھائی حصہ: شریعہ سے لے کر عجلون کے نواح سمیت دمشق کے ماتحت علاقوں تک۔ تیسرا چوتھائی: خود دمشق کا علاقہ، اور آخری چوتھائی حمص تھا، سیس اور شمالی علاقہ حمص کے ماتحت علاقوں میں شامل تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت تک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جو بڑے حلیم وکریم تھے شام کے پہلے چوتھائی حصہ پر امیر کی حیثیت سے قائم رہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں اس منصب پر باقی رکھا، بلکہ شام کا پورا علاقہ ان کے زیرِ انتظام علاقے میں شامل کر دیا، اس طرح وہ پورے شام کے نمائندہ بن گئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے یہاں ایک بچے کی ولادت ہوئی جس کا نام انھوں نے اپنے بھائی کے نام پر یزید رکھا، اور یہی وہ یزید ہے جس نے اپنے والد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد ۶۰ھ سے ۶۴ھ تک ملک کی باگ ڈور سنبھالی۔[1]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اپنے بیٹے یزید کو زمامِ حکومت سپرد کرنے کی وجہ وہ فتنے تھے جو مسلسل یکے بعد دیگرے سر اٹھا رہے تھے۔ اس وقت کی صورتِ حال یہ تھی کہ کسی ایک خلیفہ پر لوگوں کا اتفاق

(۱) یزید بن معاویہ از شیخ الاسلام ابن تیمیۃ، البدایۃ والنہایۃ: ۲۳۲/۸۔

دشوار تھا، بالخصوص جو قیادتیں امکانات کے اعتبار سے ہم سر تھیں ان میں باہم تصادم ہوسکتا تھا، جس کے نتیجے میں دوبارہ فتنے اور جنگیں برپا ہوسکتی تھیں جن کا انجام خدا معلوم کیا ہوتا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ ان کے بیٹے یزید نے حکمرانی کی مشق و مہارت اور اس کے طریقوں سے واقفیت حاصل کر لی ہے، حکومت کی متعدد ذمہ داریوں کو نباہ چکا ہے، حکومت کے فنون وطریقے سے واقف ہے، لشکر کی قیادت اور دشمن کا محاصرہ کر چکا ہے، دشمن کو زیر کرنے اور اس کے داؤ پیچ اور طور طریق سے آگاہ ہے، یہ چیزیں معاویہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک اپنے بیٹے یزید کو منتخب کرنے کے لئے کافی تھیں۔ چنانچہ یہ قناعت واطمینان حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی تمام سیاسی حکمت عملی میں نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔

اسی بنا پر انھوں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو مخاطب کر کے کہا تھا: ''مجھے اس بات کا خوف ہے کہ اپنی رعایا کو بھیگی ہوئی بکریوں کی طرح چھوڑ دوں جن کا کوئی چرواہا نہ ہو۔'' حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس اندازے اور خیال کو بعد کے واقعات نے سچ کر دکھایا، چنانچہ یزید بن معاویہ کی وفات کے بعد کیا ہوا؟ عراق اور حجاز عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے زیرِ نگیں، اور شام عبدالملک بن مروان کے زیرِ تسلط تھا۔ اور پھر دونوں کے درمیان تصادم میں خون کی ندیاں بہیں تاوقتیکہ عبدالملک بن مروان نے اپنے حریف عبداللہ بن زبیر پر غلبہ حاصل کر لیا۔

مورخ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''جب حسن (رضی اللہ عنہ) کا انتقال ہوگیا تو یزید بن معاویہ کا معاملہ مستحکم ہوگیا، اور حضرت معاویہ کو یہ یقین ہوگیا کہ یزید کے اندر حکومت کرنے کی اہلیت وصلاحیت موجود ہے۔ اس کی ایک وجہ تو والد کی اپنے لڑکے سے شدید محبت تھی، دوسری وجہ وہ دنیوی شرافت تھی جو انہیں اس کے اندر نظر آرہی تھی، بالخصوص امراء وسلاطین کی اولاد کی وہ خصوصیات جو انہیں فنونِ حرب، ملکی انتظام اور اس کی شان وشوکت کو قائم رکھنے سے متعلق معلومات کے سلسلے میں حاصل ہوتی ہیں، چنانچہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان خصوصیات کے لحاظ سے صحابہ کی اولاد میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اس کی جگہ لے سکے۔'' (البدایۃ والنہایۃ: ۲۳۲/۸۔)

عام صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) کا رویہ یزید کے بارے میں وہ تھا جسے امام احمد (رحمہ اللہ) نے بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ: ہم سے اسماعیل بن عُلَیَّہ نے بیان کیا، اور ان سے صخر بن جویریہ نے اور وہ نافع سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ: ہم نے اس شخص (یزید) سے اللہ اور اس کے

رسول کی بیعت پر بیعت کی ہے، اور میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: ”عہد شکنی کرنے والے کے لئے قیامت کے دن ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا، اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں کی عہد شکنی اور غداری ہے، اور سب سے بڑی عہد شکنی یہ ہے کہ کوئی شخص کسی سے اللہ و رسول کی بیعت پر بیعت کرے، پھر اپنی بیعت کو توڑ دے[(۱)] اس لئے تم میں سے کوئی شخص یزید کی بیعت سے دستبردار نہ ہو، اور نہ اس معاملے میں حد سے تجاوز کرے، ورنہ میرے اور اس کے درمیان یہ بات فیصلہ کن ہوگی۔“[(۲)]

حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہ) ابن مطیع کے یہاں اسے نصیحت اور یزید کی بیعت کی یاد دہانی کرنے کے ارادہ سے تشریف لے گئے، ابن مطیع نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کے لئے تکیہ لگوایا، تو انہوں نے کہا کہ: میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی ایک حدیث سنانے آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ: ”جو شخص اطاعت سے ہاتھ کھینچے گا تو وہ قیامت کے روز اس حالت میں آئے گا کہ اس کے پاس کوئی حجت نہیں ہوگی، اور جو آدمی جماعت سے الگ ہو کر مرے گا وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔“

جہاں تک خاندان نبوت کی اولاد کا تعلق ہے تو حضرت جعفر الباقر رحمۃ اللہ علیہ سے ان کا یہ قول منقول ہے کہ: حرہ کی جنگ میں نہ ابو طالب کے خاندان میں سے کوئی شریک ہوا نہ عبد المطلب کی اولاد میں سے۔“[(۳)] اور جب مسلم بن عقبہ مدینہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے ان کی عزت و تکریم کی اور مجلس میں اپنے قریب جگہ دی اور انہیں امان نامہ عطا فرمایا۔

---

(۱) صحیح مسلم ۱۷۳۵-۱۷۳۶، ترمذی نے ۱۵۸۱ میں صخر بن جویریہ سے روایت کی ہے، اور اس کو حدیث حسن قرار دیا ہے، اور احمد اور طیالسی نے ان الفاظ کے ساتھ اس حدیث کو روایت کیا ہے: ”ان لکل غادر لواء یوم القیامة یعرف به عند استه۔“ دیکھئے صحیح الجامع الصغیر: ۲/۲۲۸۔ ترجمہ یہ ہے ”ہر عہد شکنی کرنے والے کی سرین پر ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا، جس سے وہ پہچانا جائے گا۔“

(۲) احمد: ۲/۱۱۱

(۳) الحرة: حرۂ واقم کو کہتے ہیں جو مدینہ کے نواح میں واقع ہے۔ اور حرہ کا یہ واقعہ جسے اکثر مورخین نے نقل کیا ہے ۶۳ھ میں پیش آیا تھا، جس کے سپہ سالار مسلم بن عقبہ تھے۔ انہیں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تین روز تک مدینہ کی بے حرمتی کی، لوگوں کا قتل کیا، اور اس کی فوج نے خوب لوٹ مار کی۔ افسوس ناک بات یہ کہ کعبہ کی آتشزدگی اور مدینہ کی بے حرمتی کی روایتوں کو بیشتر نقل کرنے والوں نے لوط بن یحیی (ابو مخنف) کی روایت سے نقل کیا ہے، جو ایک گرا پڑا، جھوٹا قصہ گو ہے، اور وہ ایک غالی اور کٹر شیعہ ہے، اور شیعوں کے واقعات بیان کرتا ہے، جیسا کہ ابن عدی نے ”الکامل“ میں ذکر کیا ہے۔ ابو حاتم نے اسے چھوڑ دیا ہے، ابن معین کہتے ہیں کہ وہ قابلِ اعتماد نہیں ہے، اور عبد المنعم ماجد نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ وہ پر جوش شیعوں میں سے ایک ہے۔

پھر یزید نے اہل مدینہ کو کھانا بھجوانے کا حکم دیا، اور انہیں عطیات سے نوازا، اور یہ باتیں ان باتوں کے بالکل برعکس ہیں جنہیں شیعوں کی جھوٹی جماعت بیان کرتی ہے، کہ اس نے اہل مدینہ کی مصیبت پر خوشی منائی، اور ان کے قتل پر اسے تشفی اور تسلی ہوئی، اور جب اس کے سامنے حسین بن علی رضی اللہ عنہ وعن امہ وابیہ کا سر لایا گیا تو اس نے ابن الزبعری کے یہ اشعار پڑھے:

لما بدت تلك الحمول وأشرقت	تلك الرؤوس على ربى جيرون
جب وہ ہودج ظاہر ہوئے اور	جیرون کے ٹیلوں پر ان کے سر چمکنے لگے
نعق الغراب فقلت نح	فلقد قضيت من النبي ديوني
تو کوے چیخنے لگے میں نے کہا کہ نوحہ کرو	اس لئے کہ میں نے نبی سے اپنا قرض چکالیا ہے
أو من الحسين ديوني	حسین سے اپنا قرض چکالیا ہے

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''یہ سراسر جھوٹ ہے، جس نے یہ بات کہی ہے وہ کافر، جھوٹا اور افترا پرداز ہے، اور جو دیوان اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس کے بیشتر اشعار جھوٹ پر مشتمل ہیں، دشمنانِ اسلام مثلاً یہودی وغیرہ اسلام کو بدنام کرنے کے لیے اسے لکھتے ہیں، اور اس میں وہ اشعار ذکر کرتے ہیں جو بالکل جھوٹ ہوتے ہیں، مثلاً وہ کہتے ہیں کہ یزید نے یہ اشعار پڑھے:

ليت أشياخي ببدر شهدوا	جزع الخزرج من وقع الأسل
کاش کہ بدر کے شریک میرے بزرگ	خزرج کے نوجوانوں کو دیکھتے جن پر تیر گرے
قد قتلنا الكبش من أقرانهم	وعدلناه ببدر فاعتدل
ہم نے ان کے ہم سر مینڈھے کو مار ڈالا	اور اسے بدر کے برابر کیا تو وہ برابر ہو گیا

اور یہ کہ اس نے ان اشعار کو حرہ کی راتوں میں بطور نمونہ پیش کیا۔

یہ اشعار عبداللہ بن الزبعری [1] کے ہیں، جو اس نے احد کے سال اس وقت کہے تھے جب

(۱) عبداللہ بن الزبعری بن قیس بن عدی بن سعد بن سہم القرشی السہمی شاعر تھا، جس کی والدہ عاتکہ بنت عبداللہ بن عمرو بن وہب بن حذافہ بن جمع تھیں۔ یہ ان لوگوں میں سے تھا جن کی زبانیں اور دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام کے لئے انتہائی سخت تھے۔ اس کا شمار عمدہ اور بلیغ شعراء میں ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پورے قریش میں سب سے عمدہ شاعر تھا۔ محمد بن سلام کہتے ہیں: مکہ میں متعدد شعراء تھے، ان میں عبداللہ بن الزبعری کی شاعری میں سب سے زیادہ جدت طرازی ہوا کرتی تھی۔ زبیر کہتے ہیں کہ: یہی بات قریش کے راوی بھی کہا کرتے تھے کہ: وہ جاہلیت میں سب سے عمدہ شاعر تھا۔ پھر وہ اسلام لا کر اچھا مسلمان بن گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معذرت کی، آپ نے ان کی معذرت قبول فرمالی، پھر انھوں نے فتح مکہ کے بعد مختلف معرکوں میں شرکت کی۔

حمزہ رضی اللہ عنہ کو مشرکوں نے قتل کر دیا تھا۔ ابن الزبعری کافر تھا، پھر اسلام لا کر نیک مسلمان بن گیا۔ اسلام لانے کے بعد بھی اس نے اشعار کہے جن میں اپنے اسلام لانے اور توبہ کرنے کا ذکر کیا، اس لئے ایسا روا نہیں ہو سکتا کہ وہ یزید وغیرہ کے تعلق سے کسی سے کینہ رکھے، بلکہ اس کے لئے یہ بھی روا نہیں کہ وہ کسی کے بارے میں علم وعدل سے ہٹی ہوئی کوئی بات کہے۔

اسلام لانے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معذرت کرتے ہوئے اس نے یہ اشعار کہے:

يارسول المليك إن لساني	راتق فأفتقت إذ أنا بور
اے پیغمبر خدا بے شک میری زبان	میری گمراہی کے زمانے میں بند تھی، تو آپ نے اس کو کھول دیا
إذ أجاری الشيطان فی سنن الغی	أنا في ذاك خاسر مثبور
جس وقت گمراہی کے راستے میں میں شیطان کے ساتھ چل رہا تھا	**اس وقت میں خسارے اور ہلاکت میں تھا**
يشهد السمع والفؤاد بما قلــ	ت ونفس الشهيد وهي الخبير
کان اور دل آپ کی بات کی گواہی دیتا ہے	**اور گواہی دیتا ہے گواہ کا نفس اور یہ زیادہ باخبر ہے۔**
إن ما جئتنا به حق صدق	ساطع نوره مضيء منير
بے شک جو دین آپ لائے ہیں، وہ سچا اور برحق ہے۔	**اس کی روشنی روشن اور درخشاں کر دینے والی ہے۔**
جئتنا باليقين والصدق والبر	وفي الصدق واليقين السرور
آپ ہمارے پاس یقین اور سچائی لائے	**اور سچائی ویقین میں خوشی ہے**
أذهب الله ضلة الجهل عنا	أتانا الرضاء والميسور
اللہ تعالی نے ہم سے جہالت کی گمراہی کو دور کر دیا۔	**ہمارے پاس رضامندی اور خوشحالی آئی۔**

(الاستیعاب لابن عبدالبر: ۹۰۱/۱ وسیرۃ ابن ہشام: ۳۹/۴)

حضرت حسین (رضی اللہ عنہ) کی شہادت اور اہل عراق کا دو گروہ میں تقسیم ہونا

حالانکہ یزید نے حسین (رضی اللہ عنہ) کے قتل کا حکم نہیں دیا تھا، نہ ان کا سر اس کے سامنے لایا گیا،

اور نہ اس نے ان کے دانتوں کو لکڑی سے کریدا[1]، بلکہ جس شخص کی طرف سے یہ حرکتیں ظاہر ہوئی تھیں وہ عبید اللہ بن زیاد تھا، جیسا کہ صحیح بخاری سے ثابت ہے، نہ ان کا سر شہروں میں گھمایا گیا، نہ ان کے خاندان کے کسی فرد کو قیدی بنایا گیا، بلکہ شیعوں نے انھیں خطوط لکھ کر دھوکہ دیا۔ اہلِ علم اور خیر خواہوں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ ان کی دعوت قبول نہ کریں، اور جب انھوں نے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو ان کے پاس بھیجا تو ان میں سے بیشتر اپنے خطوط سے پلٹ گئے، یہاں تک کہ مسلم بن عقیل قتل کردیے گئے۔ پھر ان میں سے عمر بن سعد کی قیادت میں ایک لشکر نکلا جس نے حسین (رضی اللہ عنہ) کو نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کرکے شہید کردیا، جس طرح ان سے پہلے ان کے والد ماجد اور دوسرے اسلاف کرام شہید کئے گئے تھے۔

پھر جب یزید کے پاس سے اہل مدینہ واپس لوٹے تو عبد اللہ بن مطیع اور ان کے ساتھی محمد ابن الحنفیہ[2] کے پاس آئے، اور ان کو یزید کی بیعت سے دستبردار کرنا چاہا، تو انھوں نے انکار کردیا،

---

(۱) غزالی (رحمہ اللہ) کہتے ہیں کہ: حسین (رضی اللہ عنہ) کے قتل کا یزید نے نہ حکم دیا تھا نہ وہ ان کے قتل سے خوش تھا، بلکہ ان کے قتل پر اس کی طرف سے رنج والم کا اظہار ہوا، اور اس نے ان کے قاتلوں کی مذمت کی، اور نہ ان کا سر اس کے پاس لایا گیا، بلکہ ابن زیاد کے پاس لایا گیا تھا۔

(۲) محمد ابن الحنفیہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹوں میں سے ایک ہیں، جن کی والدہ کا نام خولہ بنت جعفر بن قیس تھا، جو قبیلۂ بنو حنیفہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ محدثین کے طبقۂ ثانیہ کے ثقہ عالم ہیں۔ ان کا انتقال ۸۰ھ کے بعد ہوا ہے۔ (دیکھئے تہذیب التہذیب: ۳۵۴/۹)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ان کے علاوہ بھی بہت سے لڑکے ہیں، جن کے ناموں کو شیعوں نے اپنی نئی کتابوں اور آج کی مجلسوں میں چھپانے کی کوشش کی ہے، مثلا: عمر اور عثمان، اور یہی عمر بڑے ہیں جن کی والدہ بنو تغلب کی صہباء بنت ربیعہ ہیں، انھوں نے اپنے والد سے اور ان سے ان کے بیٹے محمد، عبید اللہ، علی، اور ابو زرعہ عمر بن جابر الحضرمی نے روایت کی ہے۔ زبیر بن بکار نے لکھا ہے کہ: حضرت عمر بن الخطابؓ نے ان کا نام رکھا تھا، اور مصعب نے لکھا ہے کہ وہ وفات کے اعتبار سے علیؓ بن ابی طالب کے آخری لڑکے تھے۔ عجلی کہتے ہیں کہ: وہ ثقہ تھے، ابن حبان نے بھی ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے، اور کہا ہے کہ وہ ۶۷ھ میں شہید ہوئے۔ خلیفہ بن خیاط اپنی تاریخ میں ۲۶۴ پر لکھتے ہیں کہ: وہ مصعب (بن زبیر) کے ساتھ مختار کے زمانے میں شہید کئے گئے، میں کہتا ہوں کہ زبیر کی ذکر کردہ باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ولید بن عبد الملک کے زمانے تک زندہ رہے متعدد مؤرخین نے ذکر کیا ہے کہ جو شخص مصعب بن زبیر کے ساتھ قتل کیے گئے تھے وہ عبد اللہ بن علی بن ابی طالب تھے واللہ اعلم۔ تہذیب التہذیب: ۴۸۵/۷، تہذیب الکمال: ۲۸۵۔ حافظ نے تقریب ۶۱/۱ میں لکھا ہے کہ وہ ثقہ اور تابعی تھے، ولید کے عہد میں ان کا انتقال ہوا، اس کے علاوہ دوسرے اقوال بھی ہیں۔ امام بخاری ان کے بارے میں تاریخ کبیر: ۱۷۷/۶ میں لکھتے ہیں: عمر بن علی بن ابی طالب الہاشمی القرشی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کھڑے ہو کر پانی پیتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان سے ان کے بیٹے محمد نے اپنے والد کے ذریعہ اپنے دادا سے یہ بیان کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جوتا پہن کر چل رہے تھے۔ =

پھرابن مطیع اوران کے درمیان حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

ابن مطیع: یزید شراب پیتا ہے، نماز چھوڑتا ہے، اورقرآن کے احکام سے تجاوز کرتا ہے۔

ابن الحنفیہ: تم جن چیزوں کا ذکر کررہے ہو، میں نے تو وہ چیزیں یزید کے اندر نہیں دیکھی ہیں، میں اس کے پاس جاچکا ہوں، اس کے یہاں قیام کرچکا ہوں، میں نے تو اسے نماز کا پابند، خیر کا طالب، فقہ کے مسائل پوچھنے والا، اورسنت کی پابندی کرنے والا پایا ہے۔

ابن مطیع: یہ سب اس نے آپ کو دکھانے کے لئے کیا ہے۔

ابن الحنفیہ: اچھا یہ بتاؤ کہ یزید کو مجھ سے کیا ڈر یا امید ہے جس کی وجہ سے اس نے میرے سامنے اس خشوع وخضوع کا اظہار کیا، کیا اس نے دکھا کر شراب پی ہے کیا اس نے تم لوگوں کے سامنے شراب لی ہے؟

اگر تمھارے سامنے پی ہے، تو تم لوگ اس عمل میں اس کے شریک ہو، اگر تمھارے سامنے نہیں پی ہے، تو پھر تمہارے لئے یہ جائز نہیں کہ تم ایسی چیز کی گواہی دو جس کا تمہیں علم نہیں ہے۔

ابن مطیع: یہ چیز ہمارے نزدیک سچی ہے اگرچہ ہم نے اسے دیکھا نہیں ہے۔

ابن الحنفیہ: اللہ تعالی نے گواہوں کے لئے اس بات کو تسلیم نہیں کیا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: ''(ترجمہ) بجزان کے جو حق کی گواہی دیں اور انھیں اس کا علم بھی ہو۔'' (الزخرف: ۴۳) میرا تمہارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ابن مطیع: شاید آپ کو یہ گوارا نہیں کہ قیادت کسی اور کے ہاتھ میں ہو، تو ہم اپنی قیادت آپ کے سپرد کررہے ہیں۔

ابن الحنفیہ: میں تمہارے ساتھ شامل ہوکر یا تمہیں اپنے ساتھ لے کر یا اپنی پیروی کرا کر اس

=حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد کے یہ وہ حالات ہیں جو حدیث کی کتابوں میں ذکر کئے گئے ہیں، لیکن شیعوں کی کتابوں میں اس سے زیادہ کا تذکرہ یوں کیا گیا ہے کہ: علی (رضی اللہ عنہ) کے یہاں متعدد بچے پیدا ہوئے، جن کا نام انھوں نے ابوبکر، عمر، عثمان اور عباس رکھا، اور علی (رضی اللہ عنہ) بنو ہاشم میں پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے اپنے بچوں کا نام ان ناموں پر رکھا۔ اسی طرح حسن اور حسین (رضی اللہ عنہما) کی اولاد کے نام بھی ابوبکر وعمر وعثمان اور عائشہ کے نام پر رکھے گئے، اوران کے ساتھ عراق میں سب سے پہلے ابوبکر وعمر اور عثمان شہید کئے گئے۔ دیکھئے: الیعقوبی کی: تاریخ الیعقوبی، المفیدی کی: الإرشاد، الأربلی کی: کشف الغمۃ، باقر المجلسی کی: حیاۃ القلوب، الطبرسی کی: أعلام البراء، مسعودی کی: مروج الذہب، اورالمفیدی کی: الأصول المہمۃ فی معرفۃ الأئمۃ۔

کام کے لئے جنگ وجدال کو جائز نہیں سمجھتا جو تم مجھ سے چاہتے ہو۔

ابن مطیع: آپ نے اپنے والد کے ساتھ تو جنگ کی ہے۔

ابن الحنفیہ: میرے والد جیسے آدمی کو لاؤ تو میں اس جیسے کام کے لئے جنگ کرنے کو تیار ہوں جس کے لئے انھوں نے جنگ کی تھی۔

ابن مطیع: پھر اپنے دونوں لڑکوں ابوالقاسم اور قاسم کو ہمارے ساتھ لڑنے کا حکم دے دیجئے۔

ابن الحنفیہ: اگر میں انھیں حکم دوں تو گویا میں خود لڑ رہا ہوں۔

ابن مطیع: پھر آپ ہمارے ساتھ کسی مقام پر کھڑے ہو کر لڑائی کے لئے جوش دلائیے۔

ابن الحنفیہ: سبحان اللہ! میں لوگوں کو ایسے کام کا حکم دوں جو مجھے ناپسند ہے اور جسے میں خود کرنے کے لئے آمادہ نہیں، اگر میں نے ایسا کیا پھر تو یہ اللہ کے بندوں کے ساتھ خیر خواہی نہیں ہوئی۔

ابن مطیع: پھر ہم آپ کو پسند نہیں کرتے ہیں۔

ابن الحنفیہ: میں تو لوگوں سے یہی کہوں گا کہ وہ اللہ سے ڈریں، اور اللہ تعالی کو ناراض کر کے اس کی مخلوق کو راضی کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اس کے بعد وہ مکہ روانہ ہو گئے۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۳۳/۸)۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ تحریر فرماتے ہیں کہ: عراق میں دو گروہ تھے، نواصب کا گروہ جو حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے بغض رکھتا تھا؛ اور ان کی بدگوئی کیا کرتا تھا، اسی گروہ سے حجاج بن یوسف الثقفی کا تعلق تھا، دوسرا گروہ شیعوں کا تھا، جو اہل بیت سے دوستی اور محبت کا دم بھرتا تھا، جس سے مختار بن ابوعبید الثقفی کا تعلق تھا۔ صحیح مسلم میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث موجود ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ثقیف میں دو شخص ہوں گے، ایک جھوٹا، دوسرا ظالم۔ چنانچہ جھوٹا مختار بن ابوعبید الثقفی اور جھوٹا حجاج بن یوسف ہے۔

مختار نے پہلے تو شیعیت کا اظہار کیا، اور حضرت حسین (رضی اللہ عنہ) کی مدد کی اور ان کا ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ عبید اللہ بن زیاد کو قتل کر دیا، جس نے حضرت حسینؓ کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا، اور جس کے پاس ان کا سر لایا گیا تھا، اور اس نے ان کے دانتوں کو لکڑی سے کریدا تھا۔

پھر اس نے (مختار نے) دعوی کیا کہ جبرئیل اس کے پاس وحی لے کر آتے ہیں، یہاں تک

کہ ابن الزبیر نے اپنے بھائی مصعب کو اس کے مقابلہ پر بھیجا جنھوں نے اسے اور اس کے بہت سے ساتھیوں کو کیفر کردار تک پہونچایا، پھر جب عبدالملک بن مروان تخت نشین ہوئے تو انھوں نے مصعب بن الزبیر کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد یوم عاشوراء کے بارے میں نواصب اور روافض کے دو گروہ بن گئے۔ روافض اور شیعہ نے اسے ماتم، نوحہ خوانی اور سوگ منانے کا دن بنا لیا، اور نواصب (حضرت حسینؓ سے دشمنی کرنے والے) اس دن مسرت وخوشی منانے لگے۔

اور یہ ساری چیزیں بدعت وگمراہی ہیں، چنانچہ صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ: "**لیس منا من ضرب الخدود وشق الجیوب ودعا بدعوی الجاهلية.**" یعنی جو شخص ماتم کرے، گریبان چاک کرے، اور جاہلیت کے کاموں کی دعوت دے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (مسلم: ۱/۹۹، النسائی: ۴/۱۹)

نوحہ وماتم کرنے والے یعنی شیعہ، امام احمد رحمہ اللہ کی روایت کردہ اس ضعیف حدیث سے استدلال کرتے ہیں، جو فاطمہ بنت الحسین کے طریق سے مروی ہے جسے وہ اپنے والد حسین سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ: "**ما من مسلم يصاب بمصيبة فيذكر مصيبته وإن قدمت، فيحدث لها استرجاعاً إلا أعطاه من الأجر مثل أجره يوم أصيب بها.**" (۱)

یعنی جس مسلمان کو کوئی مصیبت آئے، پھر وہ اس کو یاد کر کے خواہ وہ پرانی ہو چکی ہو، انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھے، تو اللہ تعالی اسے اتنا ہی ثواب عطا فرمائیں گے جتنا مصیبت والے دن عطا فرمایا تھا۔"

پس حسین (رضی اللہ عنہ) کی روایت کردہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی مصیبت کی یاد آئے، خواہ اس کا وقت گزر چکا ہو، تو مسنون طریقہ یہ ہے کہ اس مصیبت پر انا للہ الخ پڑھی جائے، اور جب مصیبت کے وقت انا للہ الخ پڑھنا سنت ہے، تو مصیبت کا وقت گزر جانے پر انا للہ الخ پڑھنا

---

(۱) اس حدیث کی روایت امام احمد اور ابن ماجہ: ۱/۵۱۰ نے کی ہے، اس کی نسبت بوصیری "زوائد" میں لکھتے ہیں: اس کی سند میں ہشام بن زیاد کے ضعیف ہونے کی وجہ سے ضعف پایا جاتا ہے، شیخ کا اس بات میں اختلاف ہے کہ آیا اس نے ثقات سے موضوعات کی روایت کی ہے یا نہیں، حافظ ابن حجر "التقریب: ۲/۳۱۸" میں کہتے ہیں: "ہشام بن زیاد بن أبی یزید ھشام بن ابی ھشام ابوالمقدام ہی ہے، اور اسے ھشام بن ابی الولید المدنی بھی کہا جاتا ہے، اور یہ چھٹے طبقہ کا متروک راوی ہے۔ ھیثمی کہتے ہیں: ھشام بن زیاد متروک ہے، دیکھئے، الضعیفہ: ۲/۲۱۲۔ اور ذھبی "الضعفاء والمتروکین ص: ۳۲۴ میں کہتے ہیں کہ امام نسائی وغیرہ نے اسے متروک کہا ہے۔

بدرجۂ اولی سنت ہوگا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے انبیاء اور صحابۂ کرام مظلومیت کے ساتھ شہید کئے گئے، لیکن مسلمانوں کے دین ومذہب میں ان میں سے کسی کی شہادت کے دن کو ماتم اور سوگ کا دن نہیں بنایا گیا، اسی طرح اس دن کو عید اور خوشی کا دن بنانا بھی بدعت ہے، رہے وہ امور جن کی روایت یوم عاشوراء کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ سے کی جاتی ہے، نیز اس روز سرمہ لگانا، اور عاشوراء کے دن خاص قسم کی نماز پڑھنا، مثلاً یہ روایت جو آپ ﷺ سے کی جاتی ہے: "**من وسع على أهله يوم عاشوراء، وسع الله عليه سائر سنته.**" کہ جو شخص عاشوراء کے دن اپنے اہل وعیال کو وسعت وفراخی سے کھلائے پلائے گا، تو اللہ تعالی اسے پورے سال وسعت وکشادگی عطا فرمائے گا، تو اس حدیث کی نسبت امام أحمد بن حنبل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ: اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اسی طرح اس دن نئے قسم کا کھانا پکانا جس میں اناج ہو (یعنی کھچڑا) یا قربانی کا گوشت عاشوراء کے دن پکانے کے لئے بچا کر رکھنا، یہ ساری چیزیں نواصب کی بدعتوں میں سے ہیں، جس طرح اس روز سوگ منانا اور ماتم کرنا روافض اور شیعوں کی بدعت ہے۔[1]

اور اسلام کے اندر اہل سنت کی وہی حیثیت ہے جو دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اہل اسلام کی ہے، جو رسول اللہ ﷺ کے صحابۂ کرام اور آپ کے اہل بیت سے اسی طرح محبت کرتے ہیں، اور ان کے حقوق کو پہچانتے ہیں، جس طرح اللہ اور اس کے رسول نے انھیں حکم دیا ہے، چنانچہ صحیح حدیثوں میں مختلف طرق سے آپ کی یہ حدیث موجود ہے کہ: **خير الناس قرني، ثم الذين يلونهم، ثم الذين يلونهم.**[2]

ترجمہ: سب لوگوں سے بہتر قرن میرا ہے، پھر ان کا جو اس سے ملتے ہیں، پھر وہ جو اس سے ملتے ہیں۔

امام غزالی (رحمہ اللہ) کا فتوی:

ڈاکٹر صلاح الدین المنجد نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے رسالے: یزید بن معاویہ کی تحقیق کے

---

(۱) ابن القیم (رحمہ اللہ) اپنی کتاب: المنار المنیف میں تحریر فرماتے ہیں کہ: عاشوراء کے دن سرمہ، تیل اور خوشبو لگانے کی حدیثیں جھوٹے راویوں کی گڑھی ہوئی ہیں، جبکہ کچھ لوگوں نے ان کے مقابلے میں اسے رنج وغم کا دن بنا دیا۔ یہ دونوں جماعتیں بدعتی ہیں، اور سنت سے خارج ہیں۔ اسی طرح شیعوں سے جو یہ نقل کیا جاتا ہے کہ عاشوراء کے دن حلال جانوروں کا گوشت جب تک کہ حسین کا مرثیہ نہ پڑھ لیا جائے، حرام ہے، تو یہ بھی ان جہالتوں اور مضحکہ خیز باتوں میں سے ہے جس کے باطل قرار دیئے جانے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔

(۲) البخاری: ۲/۵، مسلم: ۴/۱۹۶۳-۱۹۶۴۔

صفحہ۳۳ پر ''ضمیمۂ دوم'' کے عنوان کے تحت امام غزالی (رحمہ اللہ) کے فتوے کا متن ذکر کیا ہے، جسے ہم فائدے کی غرض سے خود ڈاکٹر صاحب قدرے تصرف کے ساتھ بعینہ نقل کرتے ہیں: ''امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ سے یزید پر لعنت کرنے والے کی نسبت سوال کیا گیا کہ اس پر فاسق ہونے کا حکم لگایا جائے گا، یا لعنت کرنے کی اسے اجازت دی جائے گی، اور کیا یزید حسین (رضی اللہ عنہ) کو قتل کرنا چاہتا تھا، یا ان کا دفاع کرنا چاہتا تھا، اور کیا اس کے لئے رحمت کی دعا جائز ہے، یا اس سے سکوت کرنا افضل ہے؟ ان شبہوں کا ازالہ کر کے عند اللہ ماجور ہوں۔

آپ نے یہ جواب مرحمت فرمایا کہ: کسی مسلمان پر لعنت کرنا بالکل جائز نہیں، اور جو شخص کسی مسلمان پر لعنت کرے وہ خود ملعون ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''**المسلم ليس بلعان**'' (۱) مسلمان لعنت کرنے والا نہیں ہوتا۔ آخر مسلمان پر لعنت کیسے جائز ہو سکتی ہے، جبکہ جانوروں پر بھی لعنت کرنا جائز نہیں ہے، اور اس سے ممانعت کی گئی ہے۔ مسلمان کی حرمت و تعظیم نبی کریم ﷺ کی تصریح کے مطابق خانۂ کعبہ کی حرمت سے زیادہ ہے۔ یزید کا مسلمان ہونا ثابت ہے اور حضرت حسینؓ کو اس کا قتل کرنا، یا قتل کا حکم دینا، یا ان کے قتل سے خوش ہونا ثابت نہیں، حق تو یہ ہے کہ یہ باتیں یزید کے بارے میں درست اور ثابت نہیں ہیں، اور اس کے بارے میں بدگمانی جائز نہیں، کیونکہ مسلمان کے ساتھ بدگمانی حرام ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿**اجتنبوا كثيراً من الظن، إن بعض الظن إثم**﴾ (۲)

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''**إن الله حرم من المسلم دمه وماله، وعرضه، وأن يظن به ظن السوء۔**'' اللہ تعالی نے مسلمان کا خون، اس کا مال، اور اس کی آبرو حرام کر دی ہے، اور یہ بھی کہ اس کے ساتھ بدگمانی کی جائے۔ اور جو شخص یہ دعوی کرتا ہے کہ یزید نے حضرت حسین (رضی اللہ عنہ) کے قتل کا حکم دیا، یا ان کے قتل سے راضی ہوا، تو یہ حقیقت جان لینی چاہئے کہ وہ شخص انتہائی احمق ہے، کیونکہ وہ شخص اگر اپنے زمانہ کے وزراء و سلاطین اور بڑے لوگوں کے قاتلوں کا سراغ لگانا چاہے کہ کس نے ان کے قتل کا حکم دیا، اور کون ان کے قتل سے راضی ہوا، اور کون نہیں ہوا، تو وہ اس بات کا سراغ

---

(۱) امام ترمذی نے ۳۵۰/۴ پر اس حدیث کو روایت کیا ہے، اور اس کے الفاظ یہ ہیں: ''**ليس المؤمن بالطعان ولا باللعان، ولا الفاحش ولا البذيء**'' اور امام مسلم: ۲۰۰۷/۴ کے الفاظ یہ ہیں: ''**إني لم أبعث لعاناً وإنما بعثت رحمة.**''

(۲) الحجرات: ۴۹.

نہیں لگا سکتا، اگر چہ قاتل اس کے ارد گرد، اور اس کے دور میں ہو، اور وہ اس کا مشاہدہ بھی کر رہا ہو، تو پھر ایسے قاتل کا سراغ کیسے لگایا جا سکتا ہے جو کہ دور دراز کے ملک اور قدیم زمانے میں رہا ہو، جس پر تقریباً چار صدیاں گزر چکی ہیں۔

نیز اس واقعہ میں تعصب سے بھی کام لیا گیا ہے، چنانچہ اس واقعہ کے متعلق مختلف پہلوؤں سے بکثرت باتیں کہی گئی ہیں، اور یہ ایسا معاملہ ہے جس کی حقیقت قطعاً معلوم نہیں، اور جب حقیقت کا علم نہیں تو پھر ہر اس مسلمان کے ساتھ حسن ظن رکھنا ضروری ہے، جس کے ساتھ حسن ظن رکھا جا سکتا ہو۔

اور ان تمام باتوں کے علاوہ اگر کسی مسلمان پر کسی مسلمان کو قتل کرنے کا جرم ثابت بھی ہو جائے تو وہ کافر نہیں ہو جاتا، کیونکہ قتل کفر نہیں بلکہ معصیت اور گناہ ہے، اور جب قاتل کا انتقال ہو گیا تو ممکن ہے کہ توبہ کے بعد ہوا ہو، اگر کافر بھی اپنے کفر سے توبہ کر لے تو اس پر لعنت جائز نہیں، تو پھر قاتل پر لعنت کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے اگر وہ اپنے قتل پر توبہ کر چکا ہو؟ اور ہمیں یہ علم نہیں ہے کہ قاتل حسین (رضی اللہ عنہ) توبہ کے بغیر مرا ہے، ارشاد خداوندی ہے: ﴿وهو الذي يقبل التوبة عن عباده﴾ (الشوری: ۴۲) اور اللہ تعالی ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ کسی ایسے مسلمان پر لعنت جائز نہیں جس کا انتقال ہو چکا ہو، اب جو شخص ایسے مسلمان پر لعنت کرے گا تو وہ عاصی اور گنہگار ہو گا۔ اور اگر بالفرض اس پر لعنت جائز ہو اور وہ لعنت نہ کرے بلکہ سکوت اختیار کرے، تو بالاجماع وہ گنہگار نہ ہو گا۔ بلکہ اگر کوئی شخص زندگی بھر ابلیس پر لعنت نہ کرے تو اس سے قیامت کے دن یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تو نے ابلیس پر لعنت کیوں نہیں کی؟ لیکن اگر کوئی شخص کسی پر لعنت کرتا ہے تو لعنت کرنے والے سے پوچھا جائے گا کہ تو نے اس پر کیوں لعنت کی؟ اور تمہیں کیسے یہ معلوم ہوا کہ یہ شخص ملعون ہے؟ کیونکہ ملعون تو اللہ عز وجل کی رحمت سے دور ہوتا ہے، اور شرعی حکم یہ ہے کہ یہ ایسی غیب کی بات ہے جو کفر کی حالت میں مرنے والوں پر ہی صادق آتی ہے۔

رہی رحمت کی دعا تو وہ یزید کے لئے جائز بلکہ مستحب ہے، کیوں کہ یہ دعا ہماری ہر نماز کی اس دعا میں شامل ہے: **اللّٰهم اغفر للمؤمنين والمؤمنات**، کہ اے اللہ تمام مسلمان مرد و خواتین کی مغفرت فرما، کیونکہ یزید یقیناً مومن تھا، واللہ أعلم۔ کتبہ الغزالی۔

اسلامی کتب خانے

(ساتویں قسط)

از: دکتور علی بن علی ابو یوسف جهنی   ترجمہ وتلخیص: مسعود احمد الاعظمی

عہد فاطمی کے مصر کے کتب خانے:

مصر میں فاطمیوں کے عہد میں فاطمی خلیفہ حاکم بامراللہ نے محل سے جامع عتیق (جامع ابن طولون) میں قرآن کریم کے ایک ہزار دوسونوے ۱۲۹۰ نسخے منتقل کیے، جس میں پورا قرآن اوراس کے پارے تھے، اس میں کچھ ایسے بھی تھے جو سونے کے پانی سے لکھے ہوئے تھے، اس نے ان نسخوں کو لوگوں کو تلاوت کے واسطے مہیا کیا۔ (۱)

اور جب ۷۰۳ھ میں جامع حاکم بامراللہ کی عمارت کی تجدید ہوئی، تو اس کی تعمیر کے لیے امیر رکن الدین کو دعوت دی گئی، جس نے مسجد کے کام کی انجام دہی کے ساتھ اس میں ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا۔ (۲)

اسی طرح حاکم بامراللہ نے کتابوں کو دارالعلم سے قاہرہ کی مساجد جیسے جامع ازہر، جامع حاکم اور جامع معش وغیرہ میں منتقل کرنے کا حکم دیا، اوران میں سے آدھی کے قریب کتابیں ازہر کے لیے خاص کیں۔

کتب خانۂ ازہر کی تعمیر کی ابتدا خلیفہ عزیز باللہ کے عہد میں ہوئی، چنانچہ جب کہ اس کے عہد میں جامع ازہر علماء وفقہاء وطلباء کا مستقر بن گیا تھا، تو اس نے قرآن کریم کے بہت سارے نسخے اور کتابیں اس میں منتقل کیں، اوراس کے کتب خانے کے ساتھ اس کی دلچسپی روز افزوں رہی، یہاں تک کہ اس میں ۴۰ سے زیادہ کمرے کتابوں کے واسطے خاص ہوگئے، جن کے اندر اٹھارہ ہزار ۱۸۰۰۰

---

(۱) خطط مقریزی: ۱۲/۴   (۲) مقریزی: ۲۳۷/۳

سے زیادہ کتابیں تھیں، یہ سب باتیں مقریزی نے مسیحی سے نقل کرکے لکھی ہیں۔

جامع ازہر کا کتب خانہ عہد فاطمی میں اس کے قیام کے بعد سے اہم کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا، جس کا بیشتر ذخیرہ فقہ شیعی کی کتابوں پر مشتمل تھا، یہی وجہ تھی کہ اس کا منصب اِشراف ''داعی الدعاۃ'' کے سپرد ہوتا تھا، یہ عہد فاطمی کا سب سے بڑا مذہبی منصب تھا، ان مشہور دعاۃ میں جو کتب خانۂ جامع ازہر کے عہدۂ اشراف پر فائز رہے، ابوالفخر صالح تھے، جو ۵۱۷ھ میں داعی مقرر ہوئے، اور جن کو لائبریرین کے منصب کے ساتھ جامع ازہر کی خطابت بھی تفویض کی گئی، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور میں کتب خانۂ ازہر کے منصب کی کس قدر اہمیت تھی۔

بعد میں اس کے کلیکشن میں تنوع آتا گیا، تا آنکہ نویں صدی ہجری میں عظیم ترین اسلامی کتب خانوں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ اور جب حالات میں تبدیلی آئی، اور گیلریوں کی اہمیت ظاہر ہوئی، تو اس کی گیلریوں کی مجموعی تعداد بیس تک پہنچ گئی، ہر ایک گیلری مختلف جنس کے طلبہ کے لیے مخصوص تھی، اور ہر گیلری کا ایک مخصوص کتب خانہ تھا، جو کئی ہزار کتابوں کے مجموعوں پر مشتمل تھا، ان میں سب سے اہم اہل مغرب کے رواق کا کتب خانہ تھا۔

اسی طرح خلیفہ ظاہر نے قاہرہ کے باہر ۶۶۵ - ۶۶۷ھ میں ایک جامع مسجد تعمیر کی، جو ''جامع عانیہ'' کے نام سے معروف ہے، اس میں بھی ایک کتب خانہ تھا، اس کتب خانے پر کتابیں وقف کرنے والوں میں یحییٰ بن عبدالوہاب بن عبدالرحیم دمنہوری شافعی متوفی ۷۲۱ھ تھے، انھوں نے انتقال کے وقت اپنی کتابیں وقف کردی تھیں۔

دمشق کی جامع اموی کا کتب خانہ:

دمشق میں جامع اموی کے واقع ہونے کی وجہ سے ملک شام میں - جو کہ اسلامی تاریخ کے طویل دور تک ایک اہم علمی وثقافتی مرکز سمجھا جاتا رہا - اور تعلیمی اغراض کے لیے اس کے استعمال ہونے کی وجہ سے، وہاں کی علمی سرگرمی میں اس کا سب سے زیادہ دخل رہا، جس کے سبب وہاں ایک بہت عظیم الشان کتب خانہ وجود میں آیا، جو علماء، حکام اور دولت مندوں کے اوقاف کا ثمرہ تھا، اس پر وقف کرنے والوں میں زید بن سعید بن عصمہ ابوالیُمن کندی متوفی ۶۱۳ھ تھے، جو ایک جلیل القدر عالم تھے، انھوں نے اپنی کتابیں وقف کردی تھیں۔ ''یہ کتابیں نہایت نفیس تھیں، جن کی تعداد جلدوں کے اعتبار

سے۱۶۷تھی، جوابن سنان حلبی کے بالا خانے میں ایک بڑے ذخیرے میں رکھی گئیں''۔(۱)

اور منجملہ ان کے حسین بن محمد بن اسماعیل بن منصور بن احمد بدرالدین بن طحان متوفی ۷۴۷ھ تھے، یہ جامع اموی میں موقّت کا کام کرتے تھے اور انھوں نے اس میں بہت ساری کتابیں وقف کی تھیں۔

تیونس کی جامع زیتونہ کا کتب خانہ:

تیونس کی جامع زیتونہ میں بھی ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا، جس میں علوم وفنون کی مختلف قسموں پر مشتمل کتابیں تھیں، یہ وہ جامع مسجد تھی جس کو جلیل القدر تابعی عبداللہ بن الحجاب نے ۱۱۴ھ میں تعمیر کرایا تھا، مرورزمانہ کے ساتھ اس میں وقف کردہ کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ مہیا ہوگیا، جن لوگوں نے اس میں کتاب وقف کرنے میں حصہ لیا تھا، ان میں امیر ابوفارس عبدالعزیز بن احمد حفصی متوفی ۷۹۶ھ تھے۔''یہ کتابیں ایک بڑے ذخیرے میں تھیں جوامہات الدواوین پر مشتمل تھا، اس امیر نے جامع اعظم کے بغل میں ان کتابوں کے لیے ایک بالا خانہ بنوایا، اور اس سے استفادہ کے لیے طالب علموں پر اس کو وقف کردیا''۔(۲)

تیونس کے شہر قیروان کی جامع کبیر میں بھی ایک کتب خانہ تھا- قیروان کی جامع مسجد کا شمار عالم اسلام کی عظیم ترین مساجد میں ہوتا تھا، اور یہ جامع ازہر سے بھی بڑی مانی جاتی تھی- اس مسجد کی تعمیر ان اولین مسلمانوں نے کی تھی جنھوں نے شمالی افریقہ کو آزاد کرایا تھا، بعد میں آنے والے اس میں زیادتی اور توسیع کرتے رہے، اور مُعِزّ بن بادیس بن منصور نے اپنے عہد (۴۰۶-۴۵۴ھ) میں اس کو پایہ تکمیل تک پہنچایا، اس جامع مسجد سے ملحق ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، جو اُس دور میں ایک طویل مدت تک باقی تھا۔

مغرب کے جامع القرویین کا کتب خانہ:

مغرب کے شہر فاس کی جامع القرویین میں سلاطین بنی مرین نے فراہمی کتب کا اہتمام کیا، اور اس جامع کے طلبہ پر کتابوں کے متعدد ذخیرے وقف کیے، ان میں سب سے قدیم ''خزانۂ عنانیہ'' ہے، جس کو ابوعنان مدینی نے ۷۵۰ھ میں قائم کیا تھا، یہ خزانہ جملہ علوم ومعارف پر مشتمل تھا، نیز ابن

(۱) البدایہ والنہایہ: ۱۳/۲۷۲، و۱۱۶ (۲) ساعاتی، یحیی محمود: الوقف و بنية المكتبة العربية: ۷۳

خلدون نے اپنی تاریخ کو مکمل کرنے کے بعد اس کا ایک نسخہ اس پر وقف کیا تھا، اس کتب خانے میں اس کی دو جلدیں اب بھی موجود ہیں، ایک جلد کے سرورق پر وقف کی عبارت بھی تحریر کردہ ہے۔

یہ جامع مسجد اسلامی مغرب کے ممالک کی سب سے اہم اور مشہور مسجد سمجھی جاتی ہے، اس کی حیثیت ایک ایسی قدیم اسلامی یونیورسٹی کی ہے، جو جامع ازہر کے ہم رتبہ ہے۔

سلطان ابوفارس مرینی نے اس کے ساتھ بہت دلچسپی کا مظاہرہ کیا، اس سے ملحق مدارس قائم کیے، اور اس میں کتابوں کے ذخیرے فراہم کیے۔

اس قدیم یونیورسٹی کی سب سے اہم اور نمایاں چیز اس کا وہ نظام ہے جو ساتویں صدی ہجری کے وسط سے رائج ہے، اور جس پر یورپ سے سیکڑوں سال پہلے عمل درآمد ہو چکا ہے، اور وہ الگ الگ شعبوں کا نظام ہے، چنانچہ اس میں فقہ کا الگ شعبہ تھا، تفسیر کا الگ تھا، اور حدیث کا علیٰحدہ شعبہ تھا، ان کے علاوہ بھی بہت سے ایسے مضامین کے شعبے تھے جن کا جامع قرویین میں درس ہوتا تھا۔

اندلس کے کتب خانے:

اندلس بھی علم دوستی، علماء نوازی اور کتب خانوں کے قیام میں بغداد اور دوسرے اسلامی مراکز کے نقش قدم پر تھا، خلیفہ عبدالرحمٰن ناصر اور ان کا لڑکا مستنصر کتابوں کے قدر شناس تھے، ان کے آدمی اسکندریہ و دمشق و بغداد کی دوکانوں میں مخطوطات تلاش کرتے تھے، پھر ان کو خریدتے یا نقل کر لیتے تھے، اس طرح سے چار لاکھ کتابوں کا ذخیرہ جمع ہو گیا، جن کی فہرست ۴۴ جلدوں پر مشتمل تھی۔

اور حاکم ذاتی طور پر بہت سی کتابوں کو مطالعے میں رکھتا تھا، اُس زمانے میں اندلس کا عام ثقافتی معیار اس قدر بلند تھا کہ ہالینڈ کے مستشرق ڈوزی جیسے اہل علم کو یہ لکھنا پڑا کہ ''اندلس کا تقریباً ہر شخص لکھنا پڑھنا جانتا تھا''۔

اور حقیقت یہ ہے کہ قرطبہ کی مرکزی جامع مسجد دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی، اس میں مفت تعلیم کا انتظام تھا، اور صرف اسپین نہیں بلکہ دنیا کے مختلف حصوں سے تشنگان علم وہاں آتے تھے، اور حاکم اس میں محاضرہ اور لیکچر کے لیے اسلامی مشرق سے اساتذہ کو دعوت دے کر بلایا کرتا تھا۔

ان کے وظیفوں کے لیے کچھ مال بھی خاص کر دیا گیا تھا، منجملہ ان علماء کے مورخ ابن الفوطی بھی تھا، جو نحو کی تعلیم دیا کرتا تھا، اور ان ہی میں لغت کا مشہور بغدادی عالم ابوعلی القالی تھا، جس کی کتاب

''الأمالی'' ممالک عربیہ میں اب تک پڑھی پڑھائی جارہی ہے۔

طلیطلہ کی جامع مسجد میں جو علمی حلقے منعقد ہوتے تھے، ان کی بھی بڑی اہمیت اور شہرت تھی، ان علمی حلقوں میں عیسائی طلبہ بھی شریک ہوتے تھے، جو یورپ کے تمام علاقوں سے-بشمول انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے-اس کا رخ کرتے تھے۔

اور طلیطلہ نے ۱۰۸۵ھ میں اسپینیوں کے ہاتھوں اس کے زوال کے بعد بھی اپنی اس حیثیت کو باقی رکھا، ان اسپینیوں نے اس شہر کی ایک مسجد میں ایک بہت بھرا پُرا اور کتابوں سے مالا مال کتب خانہ اس میں پایا، جس کی شہرت ثقافت کا مرکز ہونے کی حیثیت سے شمال کے انتہائی عیسائی علاقوں تک پہنچ چکی تھی۔

اندلس والوں کی جامع مسجد میں ہمیں ایک چیز یہ بھی نظر آتی ہے کہ وہ قیام کے وقت کسی کتب خانے سے محروم تھی، اور اس کے ساتھ اس کو بعد میں شامل کیا گیا، جب وہاں کے لوگوں کو یہ احساس ستانے لگا کہ اگر وہ کتب خانے سے خالی رہی تو مکمل نہیں سمجھی جائے گی، یہ کتب خانہ قبلہ کی جانب محراب سے بائیں طرف ہے، وہاں خط نسخ میں لکھی ہوئی ایک تختی لگی ہے، اس تختی یا کتبے سے یہ نتیجہ بر آمد ہوتا ہے کہ یہ کتب خانہ ۸۱۶ھ = ۱۴۱۵ء میں بنی مرین کے ایک سلطان ابوسعید عثمان بن ابی سالم سلطان ثالث کے عہد میں قائم کیا گیا ہے۔

اندلس میں مسجدیں اور جامع مسجدیں بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی تھیں، خلفاء اور امراء نے ہر شہر اور ہر گاؤں میں مسجد تعمیر کرنے کا حکم دے رکھا تھا، اور اتنی بڑی تعداد وہاں مسجدوں کی ہوچکی تھی جس کا شمار کرنا مشکل تھا، اس کے لیے ان شہروں اور جگہوں کے ناموں کی فہرست پر ایک نگاہ ڈالنا ہی کافی ہوگا جو ابن بشکوال کی کتاب ''الصلۃ'' میں آئے ہیں، ہم کو اس میں ۵۷ ایسی مسجدوں کے نام نظر آئیں گے جن کو مختلف افراد یا خاندانوں نے تعمیر کیا تھا، ایک مؤرخ کا بیان ہے کہ صرف قرطبہ میں ۱۳۸۰ مسجدیں تھیں، اور ۸۰ مسجدیں صرف سقندہ کے اطراف میں تھیں، ان بیانات سے مسجدوں اور جامع مسجدوں کی کثرت کا پتہ چلتا ہے۔

کتب خانۂ نیسا پور:

نیسا پور کی جامع مسجد میں بھی ایک کتب خانہ تھا، جس کی جڑیں پانچویں صدی ہجری تک

پہنچتی ہیں، یاقوت حموی نے محمد بن اسحاق بن علی بن داؤدزوزنی متوفی ۴۹۳ھ کے تذکرے میں لکھا ہے کہ وہ کتابیں نقل کیا کرتے تھے۔ یاقوت لکھتا ہے کہ:

''میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کتاب کا اس سے صاف اور دیدہ زیب کوئی نسخہ نہیں ہے، اور یہ اب قدیم جامع مسجد کے کتب خانے کی ملکیت ہے، مسلمانوں پر وقف ہے، اگر کسی کو میرے دعوے کی سچائی کا یقین کرنا ہوتو اس میں اس کا مطالعہ کر کے دیکھ لے''۔(۱)

جامع اصفہان کا کتب خانہ:

اصفہان میں تاج الملک نے ایک کتب خانہ قائم کیا، جس کو جامع اصفہان سے ملحق کر دیا، یہی وہ کتب خانہ ہے جس کی نسبت ''**فرید القصر**'' کے مصنف محمد صفی الدین کاتب اصفہانی نے ابوالحسن باخرزی صاحب ''**دمیة القصر**'' کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے: ''میں نے اس کتاب —**دمیة القصر**— کو اصفہان کے اس کتب خانے میں دیکھا ہے، جو اصفہان کی جامع مسجد میں تاج الملک کا قائم کردہ ہے، اسی سے مجھے ''**فريدة القصر فی شعراء العصر**'' کی تصنیف کی تحریک پیدا ہوئی۔''

یہ مذکورہ بالا کتب خانہ ۵۱۹ سے ۵۹۷ھ کے عرصے میں موجود تھا جو کہ عمادالدین اصفہانی کا زمانہ ہے۔

آمد اور میا فارقین میں میا فارقین اور دیار بکر کے حاکم احمد بن مروان کندی کے وزیر شاعر وانشاء پرداز احمد یوسف منازی متوفی ۴۳۷ھ نے آمد اور میا فارقین کی جامع مسجدوں میں شاندار کتب خانے قائم کیے تھے، یہ کتب خانہ ان دونوں مسجدوں میں عرصۂ دراز تک باقی رہا، حتی کہ ابن خلدون کے زمانے میں بھی یہ موجود تھا، جس کی نسبت وہ لکھتا ہے: ''دونوں مسجدوں کے کتب خانے موجود ہیں، اور منازی کی کتابوں کے نام سے معروف ہیں''۔(۲)

عہد غلاماں میں بھی مسجدوں اور جامع مسجدوں میں بہت سے کتب خانے وجود میں آئے، جس میں بڑی تعداد میں کتابیں فراہم کی گئیں، اسی طرح مکتبہ ظاہر یہ بھی ہے، جس کو ظاہر بیبرس بندوق دھاری نے تعمیر کیا تھا، اس کی تعمیر ۶۶۰-۶۶۲ھ میں عمل میں آئی تھی، اس نے اس میں کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ وقف کیا، جو ہر علم وفن کی امہات الکتب پر مشتمل تھا۔

---

(۱) یاقوت حموی: ۲۰/۱۳-۲۱ (۲) ابن خلکان: ۱/۱۴۳

خاتمہ:

گزشتہ معروضات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن کریم کے نسخے ان کتب خانوں کی بنیاد کا پتھر تھے جو بعد میں اس وقت مسجدوں اور جامع مسجدوں میں قائم کیے گئے، دوسری صدی ہجری سے مختلف اسلامی ممالک میں علمی سرگرمیاں ارتقا پذیر ہوئیں، اور متنوع علوم میں تصانیف وتالیفات کی گرم بازاری ہوئی۔

اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں وسیع پیمانے پر مسجدوں اور جامع مسجدوں میں کتابوں کو وقف کرنے کا رجحان پیدا ہوا، اس خیال کی تقویت ان وقف شدہ کتب خانوں سے ہوتی ہے جو پانچویں صدی ہجری کے اوائل سے قیام پذیر ہونے لگے، جس کے کچھ نمونے اور مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

اسی طرح یہ بات بھی پوری طرح واضح ہے کہ مسجدیں پانچویں صدی ہجری سے پہلے ہی کتب خانوں سے متعارف ہوچکی تھیں، اوران کا وجود مدارس کے کتب خانوں اوران لائبریریوں سے پہلے ہوا ہے جن کے بارے میں آئندہ انشاء اللہ گفتگو کی جائے گی، مساجد میں بہت سی کتابیں اور تالیفات بھی تصنیف کی گئیں، اس کا ثبوت ان بہ کثرت مخطوطات سے ہوتا ہے جو دنیا کے گوشے گوشے میں بکھرے ہوئے ہیں، جن میں ان کے مصنفوں یا نسخہ نویسوں نے لکھا ہے کہ وہ متعدد مساجد میں تصنیف یا نقل کیے گئے۔ (۱)

جس طرح تذکرہ وتراجم کی کتابیں ایسے علماء، ادباء، اور فقہاء کے واقعات سے بھری ہوئی ہیں، جنھوں نے مسجدوں اور جامع مساجدوں کو ٹھکانا بنا کر ان کے اندر علوم ومعارف کی تحصیل کی، ان مساجد ہی میں ان کی گزربسر، درس وتدریس اور فکری نتائج کی تالیف وترتیب ہوئی۔

اوراس واسطے کہ مسجد اپنے زائرین کے شوق کی تکمیل کرے، اوران کے علمی کام میں آسانی پیدا کرے، ہر مسجد اور جامع مسجد سے ملحق ایک اچھا کتب خانہ قائم کیا جاتا تھا، جو علم وادب کے مختلف موضوعات پر بڑی تعداد میں کتابوں پر مشتمل ہوا کرتا تھا، اور لوگ ان مساجد کے لیے کتابوں کی

---

(۱) مثال کے طور پر مسجد نبوی میں امام مالک نے اپنی کتاب ''موطا'' تصنیف فرمائی، اور فسطاط کی مسجد صفین میں امام شافعی نے اپنی کتاب ''الام'' تصنیف فرمائی، اور مسجد اقصی میں امام غزالی نے اپنی ''احیاء العلوم'' کا ایک حصہ تحریر فرمایا۔

فراہمی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کیا کرتے تھے، اور بعض اہل علم کتابیں تصنیف کر کے مسجدوں پر وقف کر دیا کرتے تھے، تاکہ ان سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچ سکے، اور اس سے مصنف کی نیت صرف اجر وثواب کی ہوتی تھی، کیونکہ ان کے قلوب میں یہ احساس جاگزیں تھا کہ علم ومعرفت کی اشاعت کے لیے کوشش وکاوش، اور اس کے دائرے کو وسیع کرنے کے لیے ممکنہ جد وجہد ایک اہم راستہ ہے جس کے ذریعے مسلماں آدمی اللہ کا قرب حاصل کرتا ہے، اسی کے ساتھ اس کی کتابیں لوگوں کی دستبرد سے محفوظ بھی ہو جاتی تھیں۔

اس لیے شاید ہی کوئی ایسی مسجد یا جامع مسجد تم کو ملے گی جس میں مفید کتابوں کا ذخیرہ نہ ہو، اور اس طرح بیشتر مسجدیں اور جامع مسجدیں علمی اداروں کی طرح ہو گئیں، اور یہ طریقہ درس وتدریس، بحث وتحقیق اور تصنیف وتالیف کی کامیابی میں بہت مؤثر ثابت ہوا۔

اس طرح اسلامی تاریخ میں کتب خانہ مساجد کے قیام کے ساتھ منصۂ شہود پر آیا، اور اسلام کی سب سے پہلی مسجد کے ساتھ اس کا ظہور ہوا، اس کی آغوش میں اس کو نشو ونما اور فروغ حاصل ہوا، اور اسلامی سلطنتوں کے زمانے میں وہ اپنی عظمت وبلندی کی انتہا کو پہنچ گیا، تربیتی، علمی اور معاشرتی کردار ادا کرتا رہا۔ اور مسلمان خلفاء اور حکمرانوں کے تمام تر مدت حکومت وخلافت میں ان کا اہم مقصد اور ان کی توجہات اور دلچسپیوں کا اہم مرکز رہا۔

امت کی تاریخ کے ساتھ اسلامی مساجد کی تاریخ وابستہ رہی، جو مسلمانوں کے تہذیبی وتمدنی ارتقاء کی داستان بیان کرتی ہے، مسجدوں نے مکہ مکرمہ، قاہرہ، دمشق، بغداد، استانبول، قیروان، سامراء، بخاری، اصفہان، سمرقند، آمد، میافارقین، قرطبہ اور طلیطلہ وغیرہ میں علم ومعرفت کا پیغام پھیلایا، اور مسلمان نسلوں کو فقیہ ومحدث ومفسر بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا، جس طرح مساجد نے اسلام، اس کی سادہ اور بے لوث تعلیم، عربی زبان اور اسلامی تہذیب کے فروغ واشاعت میں اہم حصہ لیا۔

پہلی صدی ہجری سے لے کر کئی صدیوں تک عالم اسلام کی بیشتر مساجد میں علم کے حلقے اور مجلسیں ترقی پذیر رہیں، بلکہ ان میں سے بعض حلقے اب تک جاری اور طلبگاران علم سے معمور ہیں۔

اور بہت سی مسجد اور جامع مسجدیں اب بھی بحمد اللہ بیش قیمت کتابوں اور تصانیف سے بھری پڑی ہیں۔

کتاب ''انوار مصابیح'' پر ایک نظر

[پیش نظر تحریر ماہنامہ دارالعلوم کے شمارے میں شائع ہوئی تھی، اس میں مضمون نگار کا نام نہیں تھا، رسالہ دارالعلوم سے نقل کر کے یہ مضمون شائع کیا جارہا ہے۔ادارہ]

مؤلف نے اس کتاب میں ''رکعات تراویح'' مؤلفہ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کا جواب دینے کی بڑی کوشش کی ہے، مولانا حبیب الرحمٰن نے اپنی اس کتاب میں رکعات تراویح پر محققانہ بحث کی تھی، رسالہ دارلعلوم کے کسی پرچہ میں اس پر تبصرہ بھی نکل چکا ہے۔

مناظرانہ تحریروں میں آج کل جو حربے استعمال ہوتے ہیں، ان میں سے کوئی حربہ ایسا نہیں ہے جو اس کتاب میں استعمال نہ کیا گیا ہو، اور مؤلف رکعات تراویح ہی نہیں بلکہ مہتمم صاحب مدظلہ دارلعلوم دیوبند، حضرت گنگوہیؒ، مولانا محمد علی مونگیری اور حضرت امام اعظمؒ وغیرہم کسی کو بھی انھوں نے نہیں بخشا ہے، بہر حال اس سے مؤلف کے دل کی بھڑاس چاہے نکل گئی ہو، مگر کوئی مہذب طبقہ ان باتوں کی وجہ سے ان کے حق میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کرسکتا۔

کسی عالم کی رائے یا تحقیق سے اختلاف ہو تو اپنے وجوہِ اختلاف کے اظہار کا آزادانہ حق ہر شخص کو حاصل ہے، مگر اس حق کو استعمال کرنے میں شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہئے، نہ اپنے مقابل کی باتوں کو توڑ مروڑ کر خواہی نخواہی غلط ثابت کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ہم کو افسوس ہے، کہ انوار مصابیح کے مؤلف نے ان دونوں باتوں میں سے کسی کا لحاظ نہیں کیا ہے۔

ان کی کتاب کا کوئی صفحہ نا ملائم الفاظ، ناشائستہ کلمات، اور ناروا حملوں سے خالی نہیں ہے۔ ہم ان الفاظ اور فقروں کو نقل کرنے سے قصداً بچنا چاہتے ہیں، اس لیے اس کا کوئی نمونہ پیش نہیں کرتے، ہاں دوسری بات کے سلسلے میں چند واضح مثالیں پیش کرتے ہیں، ان سے مؤلف کے جوابوں کی نوعیت اور ان کی ''قوت'' کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔

پہلی مثال!

ص۲۹ پر لکھتے ہیں کہ ”کس طرح دارالعلوم دیوبند کے مہتمم کو یہ جرأت ہوتی ہے کہ وہ ہر سال رمضان شریف کے موقع پر یہ اعلان کردیا کرتے ہیں کہ بعض لوگ آٹھ رکعت تراویح کو سنت کہتے ہیں، یہ درست نہیں“۔

سوال یہ ہے کہ جماعت دیوبند کی تحقیق جب رکعات تراویح کے سلسلہ میں یہی ہے کہ وہ بیس ہیں اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی اس سنت کو ”**علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین**“ کی روشنی میں سنت سمجھنے میں کوئی مانع نہیں، تو حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کے اس اعلان پر اعتراض کیا ہے؟ جس طرح آپ اپنے مسلک کی اشاعت کرتے ہیں، اس طرح کیا دوسرے لوگوں کو اپنے مسلک کی اشاعت کی اجازت نہیں؟

دوسری مثال!

رکعات تراویح ص...... پر ”**وقال ابن عدیؒ أحادیثه غیر محفوظة**“ کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: اور ابن عدیؒ نے کہا ہے کہ اس کی حدیثیں محفوظ نہیں ہیں (یعنی شاذ ومنکر ہیں) مؤلف ”انوار مصابیح“ نے علم وفن کے اعتبار سے اس ترجمہ وتفسیر کو قابل گرفت بلکہ غلط قرار دیا ہے، اور لکھا ہے کہ محفوظ کا مقابل شاذ ہے منکر نہیں ہے۔

اب آیئے علم وفن کے اعتبار سے رحمانی صاحب کے اس دعوے کو جانچیے:

تدریب الراوی اصولِ حدیث کی وہ کتاب ہے جس کو رحمانی صاحب کے استاد نے بھی سراہا ہے، اُس میں مذکور ہے ”**قد علم مما تقدم بل من صریح کلام ابن الصلاح أن الشاذ والمنکر بمعنیً**“ (ص۸۴) یعنی مذکورہ بالا بیان سے بلکہ ابن الصلاح کے صریح کلام سے یہ بات معلوم ہوئی کہ شاذ ومنکر دونوں ایک معنی میں ہیں۔ پس جب دونوں ایک معنی میں ہیں تو دونوں ہی محفوظ کے مقابل ہوں گے، صرف شاذ کیسے ہوگا منکر کیوں نہیں ہوگا۔

نیز رحمانی صاحب نے جس طرح شاذ کو محفوظ کا مقابل بتایا ہے، اسی طرح غیر محفوظ کو بھی صراحۃً محفوظ کا مقابل کہا ہے (ص۱۰۳) اب سنیے کہ امام ابوداوٗدؒ نے حدیث **ان النبی صلی الله علیه وسلم اتخذ خاتما من ورق** کو کہا ہے: **هذا حدیث منکر**، اور بعینہٖ اسی حدیث کی نسبت نسائی نے کہا ہے: **هذا حدیث غیر محفوظ**. پس اگر منکر محفوظ کا مقابل نہیں ہے تو رحمانی

صاحب کے نزدیک امام نسائی کا اس کو غیر محفوظ کہنا غلط ہے، یا ابوداؤد کا اس کو منکر کہنا صحیح نہیں ہے۔

تیسری مثال!

رکعات تراویح ص ۲۸ میں حضرت جابرؓ کی حدیث پر کلام کرتے ہوئے عیسیٰ بن جاریہ کا تفرد دکھایا گیا ہے، اور اس تفرد کی وجہ سے بھی اس روایت کے مجروح ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس بحث کا جواب رحمانی صاحب نے تقریباً چار صفحات میں دیا ہے، مگر اس کا خلاصہ صرف اتنا ہے کہ جب کوئی راوی کسی حدیث کے روایت کرنے میں متفرد ہو، اور حافظ ضابط مقبول التفرد کے درجہ سے وہ دور نہ ہو تو اس کی حدیث حسن ہوگی اور اگر اس درجہ سے دور ہو تو اس کا تفرد مردود اور شاذ و منکر کے قبیل سے ہوگا (رحمانی صاحب ملاحظہ فرمائیں کہ خود وہ شاذ و منکر کو جمع کر رہے ہیں)

اس کے بعد انھوں نے عیسیٰ کے تفرد کو مقبول ثابت کرنے کے لیے لکھا ہے کہ جو جرحیں اس پر کی گئی ہیں وہ سب غیر مقبول و غیر ثابت ہیں اور اس کے مقابلے میں اس کی تعدیل و توثیق معتبر ہے، لہذا حفظ و ضبط کے اعتبار سے اگر وہ بہت اعلیٰ درجہ پر نہ ہو تو بہت گرا ہوا بھی نہیں ہے، بناء بریں اس کی یہ حدیث......ضعیف یا شاذ و منکر کسی حال میں نہیں کہی جاسکتی۔ (ص ۱۰۷)

افسوس ہے کہ رحمانی صاحب نے اصولِ حدیث کے اس مسئلے کو سمجھانے کے لیے تو ابن الصلاح و ابن حجرؒ کی لمبی لمبی عبارتیں نقل کیں، لیکن ایسے تفرد کے منکر ہونے کی جو مثال علمائے اصول نے بیان کی ہے اس کو انھوں نے نقل نہیں کیا، ورنہ اسی مثال سے فیصلہ ہو جاتا کہ عیسیٰ کا تفرد قابل قبول ہے یا مردود۔

اس کی مثال تدریب الراوی میں یہ پیش کی ہے کہ ابوذکیر نے ہشام سے روایت کیا ہے: **کلوا البلح بالتمر، الحدیث**، اس کو امام نسائی نے ابوذکیر کے تفرد کی بناء پر منکر کہا ہے، حالانکہ ابوذکیر شیخ صالح ہے، مسلم نے اس کی روایت متابعت میں ذکر کی ہے؛ مگر اس کے باوجود وہ اس درجہ کو نہیں پہنچا کہ اس کا تفرد مقبول ہو، بلکہ ائمہ نے اس کی تضعیف کی ہے۔

ابن معین نے اس کو ضعیف کہا، اور ابن حبان نے **لایحتج بہ** کہا، عقیلی نے کہا **لایتابع علی حدیثه**. اور ابن عدی نے اس کی چار منکر حدیثیں ذکر کی ہیں (تدریب ص ۸۴)

علمائے اصول کی اس مثال کو سامنے رکھ کر عیسیٰ پر جو جرحیں ہوئی ہیں، دیکھئے ان کے جو

جوابات رحمانی صاحب نے دیے ہیں وہ سارے جوابات ابوذ کیر کی طرف سے بھی دیے جا سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر دیے جا سکتے ہیں تو ابوذ کیر کی حدیث کیوں منکر قرار دی گئی اور ان جوابات کے امکان کے بعد بھی وہ منکر قرار دی گئی، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ عیسیٰ کی روایت بھی منکر نہ قرار دی جائے۔

عیسیٰ پر یہ جرحیں ہوئی ہیں، ابن معین نے کہا: **لیس بذاک**، اور **عندہ مناکیر**. امام نسائی وابوداؤد نے کہا، **منکر الحدیث**، نیز نسائی نے اس کو متروک بھی کہا، ساجی وعقیلی نے اس کو ضعفاء میں ذکر کیا، ابن عدی نے کہا: **أحادیثه غیر محفوظة**. نیز ابن عدی نے عیسیٰ کی اس روایت کو اس کے مناکیر میں شمار کیا ہے۔ رحمانی صاحب ان جرحوں کا یہ جواب دیتے ہیں کہ:

۱:- عیسیٰ پر جو جرحیں کی گئی ہیں وہ مبہم ہیں یعنی جرح کا سبب نہیں بتایا گیا۔ ص ۹۵

۲:- جارحین میں ابن معین، نسائی، عقیلی، ابن عدی متعنت ہیں (ص ۹۸) اور ساجی جرح میں متیقظ نہ تھے۔ ص ۹۹

۳:- ابوداؤد کی جرح اور ان کی موافقت سے نسائی کی جرح بھی ضرور قابل قبول ہوتی، مگر ابوزرعہ وابن حبان کی توثیق کے مقابلہ میں وہ مقبول نہیں ہے اس لیے کہ مبہم ہے۔

اب آیئے دیکھیں کہ ابوذ کیر کی طرف سے بعینہ یہی جواب ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تو سب سے پہلے ابن معین کی جرح کو لیجئے، وہ مبہم بھی ہے اور ابن معین متعنت بھی ہیں، ان کے بعد ابن حبان ہیں وہ بھی متعنت ہیں (دیکھو انوار مصابیح ص ۹۷) اور ان کی جرح بھی غیر مفسر ہے، دیکھو (ابکار المنن) اور عقیلی وابن عدی کو ابھی سن چکے ہو کہ وہ بھی متعنت ہیں، لہٰذا ان کے مقابل میں جس نے ان کو شیخ صالح کہا ہے اس کی تعدیل معتبر ہوگی، اور نسائی کا ابوذ کیر کی حدیث کو منکر کہنا غلط بلکہ بقول رحمانی صاحب اصول حدیث سے بے خبری (ص ۹۵) کی دلیل ہے۔

لیکن ہمارا فیصلہ مانیے تو امام نسائی کا فیصلہ صحیح اور مطابق اصول ہے، اور ابوذ کیر کی طرح عیسیٰ ابن جاریہ کی روایت بھی منکر ہے، اور رحمانی صاحب نے جو محاکمہ اس کی جرح وتعدیل کے باب میں کیا ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ہم اس بات پر بھی اظہار افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ رحمانی صاحب نے عیسیٰ کی طرف سے جواب دہی ص ۹۴ سے شروع کی ہے اور یہ جواب دہی ص ۱۰۲ تک چلی گئی ہے، ان

صفحات کو آپ بغور پڑھئے کہیں بھی کسی جرح کی نسبت انھوں نے یہ نہیں دکھایا ہے کہ یہ جرح ثابت نہیں ہے، مگر ص ۱۰۷ میں وہ ان سب جرحوں کو غیر مقبول کے ساتھ غیر ثابت بھی کہنے لگے، رحمانی صاحب جب دوسروں کو تلبیس حق کا الزام دیتے ہیں تو ان کو چاہئے کہ اپنا دامن تو اس داغ سے پاک رکھیں۔

چوتھی مثال:

ص ۱۲۱ پر حافظ ابن حجرؒ کی عبارت "**قال الذهبي وهو من أهل الاستقراء التام في نقد الرجال لم يجتمع اثنان من علماء هذا الشان**" الخ کی نسبت رحمانی صاحب فرماتے ہیں کہ علامہ مئوی اپنی خوش فہمی سے اس پوری عبارت کو حافظ ابن حجرؒ ہی کا کلام سمجھ رہے ہیں............ حالانکہ اس عبارت میں "**لم يجتمع**" سے لے کر آخر تک یہ ذہبی کا مقولہ ہے"۔

ہم کو حیرت ہے کہ رحمانی صاحب کو "علامہ مئوی" پر اس خوش فہمی کا الزام لگانے کی جرأت کس طرح ہوئی! جب کہ وہیں "علامہ" نے تصریح کر دی ہے کہ حافظ ابن حجرؒ نے شرح نخبہ میں ذہبی کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے کہ کسی ثقہ راوی کو ضعیف قرار دینے پر دو ماہرین فن کا اتفاق نہیں ہوا ہے، اسی طرح کسی ضعیف راوی کو ثقہ قرار دینے پر بھی دو ماہرین متفق نہیں ہوئے ہیں" (ص ۳۲) دیکھئے جس حصہ کو آپ ذہبیؒ کو مقولہ کہہ رہے ہیں اسی کو "علامہ مئوی" بھی ذہبی کا فیصلہ کہہ رہے ہیں اور ابن حجرؒ کو اس کا ناقل بتا رہے ہیں، لہٰذا خوش فہمی کا طنز کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے؟ ہاں یہ صحیح ہے کہ "علامہ مئوی" نے اس فقرہ کو ذہبی کا مقولہ مانتے ہوئے بھی "محدث مبارک پوری" پر یہ اعتراض کیا ہے کہ انھوں نے ابن حجر کا پورا کلام نقل نہیں کیا، اس لیے کہ ابن حجرؒ اس مقام پر جو بولے ہیں (یا جو بات انھوں نے لکھی ہے) وہ پوری بات یہ ہے کہ "کہا ذہبیؒ نے دراں حالیکہ وہ نقد رجال میں اہل استقراء تام سے تھے کہ کبھی اس فن کے دو عالم کسی ثقہ کی تضعیف یا کسی ضعیف کی توثیق پر متفق نہیں ہوئے" یعنی ابن حجرؒ جو بات کہہ رہے ہیں یا جو جملہ انھوں نے استعمال کیا ہے، وہ **قال الذهبي** (فعل وفاعل) اور وھو الخ (حال) اور **لم يجتمع** الخ (مقول یا مفعول) سے مرکب ہے۔ محدث مبارک پوری نے اس پورے جملہ کا صرف حال نقل کر کے اپنی طرف سے اس پر ایک بات متفرع کر دی، اب ہم ابن حجرؒ اور محدث مبارک پوری دونوں کی عبارتیں نقل کر دیتے ہیں، اس کے بعد آپ خود فیصلہ کیجئے کہ "علامہ مئوی" نے جو اعتراض اٹھایا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں؟

عبارت ابن حجرؒ: ''قال الذهبی وهو من أهل الاستقراء التام فی نقد الرجال لم يجتمع اثنان من علماء هذا الشان قط علی توثيق ضعيف ولا علیٰ تضعيف ثقة''.

عبارت مبارک پوری: ''قال الحافظ ابن حجرؒ فی شرح النخبة الذهبی أهل الاستقراء التام انتهیٰ فلما حکم الذهبی بأن إسناده وسط'' الخ اس سیدھی سی بات کوتوڑ مروڑ کر یہ سمجھانا کہ حافظ ابن حجرؒ کی عبارت میں بس یہی ٹکڑا (وهو من أهل الاستقراء التام فی نقد الرجال) حافظ ابن حجر کا کلام ہے، اوراس کو مبارک پوری نے پورا کا پورا نقل کیا ہے۔ کج بحثی نہیں تو اور کیا ہے؟

ہم ابن حجرؒ کے کلام کا تجزیہ کر کے ثابت کر چکے ہیں کہ مذکورہ بالا پوری عبارت حافظ ابن حجر کا کلام ہے اوران کا جملہ تامہ ہے، حتی کہ ذہبی کا مقولہ بھی اگر چہ محکی کے درجہ میں ذہبی کا مقولہ ہے مگر حکایت کے درجہ میں ابن حجرؒ کے کلام اوران کے جملہ تامہ کا جزو ہے۔

(رحمانی صاحب سے ایک سوال):

قرآن پاک میں ایک آیت ہے: وإِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْم''

رحمانی صاحب بتائیں کیا اس آیت میں صرف وهو يعظه اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور آگے کا حصہ يا بُنی الخ اللہ کا کلام نہیں ہے؟ انجام سوچ کر جواب دیجئے گا۔

رحمانی صاحب کی ژولیدہ بیانی اور اپنے ہی قلم سے اپنی تردید

اوپر والی بحث میں رحمانی صاحب نے پہلے تو ص ۱۲۰ میں لکھا کہ ''انھوں نے'' (محدث مبارک پوری نے) کلام کے جس حصہ کو چھوڑ دیا ہے وہ نہ اہل حدیث کے مذہب کے خلاف ہے نہ اس کے چھوڑ دینے سے حافظ کے کلام کا منشاء ردوبدل ہوتا ہے'' اس کو بغور پڑھیے، رحمانی صاحب کلام کے حصہ کا ذکر کر رہے ہیں، اب ان سے پوچھیے کہ کلام سے کس کا کلام مراد ہے؟ اگر ابن حجرؒ کا تو آپ نے تسلیم کرلیا کہ مبارک پوری صاحب نے ابن حجرؒ کے کلام کا ایک حصہ چھوڑ دیا، اور اگر کلام سے ذہبیؒ کا کلام مراد ہے تو ذہبیؒ کے کلام کا حصہ نہیں بلکہ پورا کلام مبارک پوری صاحب نے چھوڑ دیا ہے، جیسا

کہ ص ۱۲۱ میں آپ نے خود اعتراف کیا ہے۔

حاصل یہ کہ یہاں رحمانی صاحب نے کلام کے ایک حصہ کا چھوڑ دینا تسلیم کیا، لیکن فوراً ہی پھر پلٹا کھا کر کہنے لگے کہ ''سرے سے یہ الزام ہی غلط ہے کہ مولانا مبارک پوری نے ابن حجرؒ کا کلام بالکل ادھورا نقل کیا'' ص ۱۲۰۔

اسی طرح ص ۱۲۲ میں پہلے تو انھوں نے تسلیم کیا کہ ''نقد رجال'' کے باب میں ذہبی کو ''اہل استقراء تام'' قرار دے کر حافظ ابن حجرؒ نے ان کے فیصلہ کی اہمیت ثابت کی ہے۔ مولانا مبارک پوری نے اس کو چھوڑ دیا، اور اس کے بجائے اپنی طرف سے ایک دوسرے فیصلے کو قوت پہنچائی............

پھر لکھتے ہیں کہ ''ایک ہی بات کو دو عالموں نے دو الگ الگ موقعوں پر پیش کیا ہے یا دو الگ الگ نتیجے نکالے ہیں۔ لیکن کسی صاحبِ ذوق سے پوچھو کہ اگر کلام اس کی صلاحیت رکھتا ہے کہ اس سے مختلف تفریعات پیدا کی جا سکیں تو............ یہ عیب کی بات ہے یا نہیں ص ۱۲۲۔ یعنی مولانا رحمانی نے یہاں تسلیم کر لیا کہ مولانا مبارکپوری نے ذہبیؒ کے اہل استقراء نہ ہونے سے دوسرا نتیجہ نکالا ہے اور ابن حجرؒ کی تفریع سے الگ ایک بات اس پر متفرع کی ہے اور یہ ان کا ہنر ہے مگر چند ہی سطروں کے بعد فرمانے لگے کہ یہ ضابطہ کلیہ (کہ ذہبی اہل استقراء تام سے ہیں تو احادیث کی اسنادوں پر ان کا حکم صواب ہے) تو مولانا مبارک پوری نے نہیں لکھا ہے، اور نہ ذہبی کے صاحب استقراء تام ہونے پر اس کو متفرع کیا ہے، ص ۱۲۲۔

اس ارشاد سے رحمانی صاحب کا اگر یہ مطلب ہے کہ مولانا مبارک پوری صاحب نے ضابطہ کلیہ نہیں بلکہ ایک حکم جزئی کو متفرع کیا ہے، تو سوال یہ ہے کہ اس صورت میں قیاس کی منتج شکل کیونکر بنے گی، اس کے لیے تو کبریٰ کی کلیت شرط ہے، اور اگر یہ مطلب ہے کہ نہ کلیہ نہ جزئیہ کسی چیز کو بھی متفرع نہیں کیا ہے، تو اس بات سے قطع نظر کہ یہ خود آپ کے سابق ارشاد کے خلاف ہے، سوال ہوتا ہے کہ پھر انھوں نے ابن حجرؒ کے حوالہ سے ذہبی کا اہل استقراء تام ہونا کس مقصد کے لیے ثابت کیا۔

اہل علم کے خطوط بنام حضرت محدث کبیرؒ

(مکاتیب حضرت مولانا منظور نعمانیؒ)

ترتیب: مسعود احمد الاعظمی

مخدومی معظمی! سلام مسنون

رکعات تراویح کی باقی کاپیاں حاضر ہیں۔ چند صفحے اس کے بعد بھی باقی ہیں، یہ حصہ ۲۲۴ صفحات پر ختم ہورہا ہے۔ آج ۸ر رمضان ہوچکی ہے، اب اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ کتاب سارے مرحلوں سے رمضان ہی میں گزر کے تیار ہوسکے، عجلت سے کام ہوا تو انشاء اللہ شوال کے پہلے ہفتہ عشرہ میں تیار ہوسکے گی۔ اب میری رائے یہ ہے کہ جب رمضان میں اشاعت کی امید نہیں رہی تو پھر کتاب کو تقسیم نہ کیا جائے، تقسیم سے ایسے رسائل کی افادیت بہت کم ہوجاتی ہے، پہلے حصہ کی اشاعت سے بہت سے مشتاقین کے جذبۂ شوق کی تسکین ہوجائے گی اور دوسرے حصہ کے لیے ان میں پھر شوق کی بیتابی نہیں رہے گی، اس لیے اب باقی مسودہ بھی آجانا چاہئے تاکہ مسلسل کتابت ہوجائے۔ جو کاغذ لیا گیا ہے اُس میں پوری کتاب ۵۰۰ تیار ہوجائے گی، اور بجائے اوائل شوال کے بس اواخر شوال میں انشاء اللہ مل جائے گی۔ یہاں کے اور اہل مشورہ کی رائے بھی یہی ہے۔ خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو، والسلام۔

محمد منظور نعمانی

....

دفتر الفرقان بریلی ۲۹ر ذی الحجہ ۵۹ھ

مخدومی محترمی!

سلام مسنون۔

بخدا بڑی خیر ہوئی کہ وہ پچاس خریدار پیدا نہ ہوئے، صورت یہ ہے کہ طباعت شروع کرانے

تک یہ اندازہ تھا کہ تیاری تک زیادہ سے زیادہ ایک ہزار کی کل مانگ ہوگی۔اسی بنا پر ۱۲۵۰صرف تیار کرایا لیکن دوران طباعت ہی میں خریداری زیادہ آئی اور اب اندازہ یہ ہے کہ مشکل سے ۴۰، ۵۰ پرچے بچیں گے ایک ہزار سے کچھ زیادہ تو خریدارانِ قدیم وجدید کو جائیں گے اور سوڈیڑھ سوا کابر واحباب کو اور تبادلوں میں، اگر کہیں آپ کے وہ پچاس بھی آجاتے تو بس صفر ہی رہ جاتا۔اور نقصان الگ ہوتا کیونکہ اس وقت لاگت کا اندازہ (ایک روپیہ) فی پرچہ سے کم ہی تھا لیکن اب تیاری پر جو حساب لگایا تو زیادہ بیٹھ رہا ہے، اس لیے اب ایسے خریداروں کو مجبوراً انکار کیا جارہا ہے جو نمبر سے خریدار ہونا چاہتے ہیں اور اسی حساب میں نمبر مانگتے ہیں۔بہرحال جو ہوا بہت اچھا ہوا۔

نمبر انشاءاللہ ۸-۱۰ محرم تک حاضر خدمت ہوگا۔

گرامی نامہ کل مل چکا ہے لیکن رسالہ کوئی آج بھی نہیں آیا، اس لیے مصارف طباعت کے متعلق جواب کیا دوں؟

حضرت استاذ مدظلہ امسال بریلی تشریف نہیں لائے ہیں سنبھل ہی ہیں۔

نمبر کی طباعت مکمل ہو چکی ہے فہرست والی ابتدائی کاپی بس کل ملے گی انشاءاللہ۔''دل آویز باتوں'' کے اشتہار کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں ہے، انشاءاللہ آئندہ کسی پرچہ میں۔والسلام

محمد منظور نعمانی عفااللہ عنہ

....

بسم اللہ

بریلی-۲۳رمحرم ٦٦

حضرت مخدومی! دامت فیوضکم۔سلام مسنون۔

گرامی نامہ نے مشرف فرمایا۔اس حادثۂ فاجعہ[1] کی اطلاع مجھے اسی سے ہوئی ہے فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہم لوگوں کا عجیب حال ہے کسی نعمت کی قدر بھی کھونے سے پہلے پوری نہیں ہوتی، اس خبر

(۱) حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کا سانحۂ وفات مراد ہے، جو ۲۱رذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کو پیش آیا تھا (مرتب)

کے سننے سے پہلے کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ ان کے مکارم ومعالی پر دھیان کیا ہوتا۔

اب ان کی ایک ایک چیز (جو معلوم ہے) یاد آتی ہیں اور ان کی نورانی آنکھوں میں (میرے ہی ساتھ یا سب ہی کے ساتھ اور غالبًا سب ہی کے ساتھ) محبت وشفقت کی جو لہریں محسوس ہوتی تھیں، وہ اس وقت خاص طور سے سامنے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے قوی بہت ہی قوی امید ہے کہ ان کے ساتھ خاص فضل ورحمت کا معاملہ ہوگا، اور دل سے دعا بھی ہے **اللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ وَعَافِهِ وَاعْفُ عَنْهُ وَأَكْرِمْ نُزُلَهُ وَوَسِّعْ مُدْخَلَهُ.**

اور خود جناب والا سے کیا عرض کروں، کسی بدوی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے حضرت عباسؓ کی تعزیت میں جو دو شعر پڑھے تھے وہ خاص طور سے یاد آرہے ہیں اور سب سے بڑی تعزیت تو خود ان کے نام نامی میں ہے۔

گھر کے دوسرے اپنے عزیزوں سے البتہ اتنا کہنے کو جی چاہتا ہے کہ اللہ کا جو بندہ اپنے پاس کوئی بڑا مادی سرمایہ نہیں رکھتا تھا، بلکہ اس کا سرمایہ صرف صلاح وتقویٰ ہی تھا، جس کو اللہ تعالیٰ نے ''خیر الزاد'' فرمایا ہے، اس کے پسماندگان کو جائداد یا خزانہ تو ملا نہیں (جو عام دنیا کے نزدیک بڑی چیز ہے) پھر اگر وہ صلاح وتقوے کو بھی اس کا خاص ورثہ قرار دے کر نہ اپنائیں تو وہ بڑے گھاٹے میں ہیں، اللہ تعالیٰ مجھے اور گھر کے سب عزیزوں کو توفیق دیں کہ ہم ان خاسرین میں سے نہ ہوں۔

دفتر ''الفرقان'' کو لکھنؤ منتقل کرنے کا فیصلہ قریب قریب ہو چکا ہے، شاید فروری تک عمل میں بھی آجائے، فی الجملہ قرب بڑھ ہی جائے گا، تدریس میں ہی لگا رہنا میری سمجھ میں بھی نہیں آتا اور وہ بھی مفتاح العلوم میں، اس مسئلہ پر انشاء اللہ پھر بات ہوگی۔ والسلام

نعمانی غفرلہ

....

دفتر الفرقان بریلی ۱۲/ربیع الثانی ۶۲ھ

مخدومی محترمی! دامت فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

گرامی نامہ موصول ہوا، کتابیں بھی دفتر میں آگئیں، ''نصرت الحدیث'' ماشاء اللہ بہت ہی

اچھی چھپی ہے، انشاء اللہ اس کے متعلق خود ہی کچھ لکھوں گا، کتابوں کا نرخ نہیں لکھا گیا ہے، اگر مولانا محمد ایوب صاحب ہی لکھ دیتے تو مجھے سہولت ہو جاتی۔ اب میرا خیال یہ ہے کہ ''نصرت'' اور ''دل آویز باتیں'' ۱/۳ کے حساب سے درج کر لی جائیں اور بقیہ کتابوں کے حساب میں ''شارع حقیقی'' اور ''احکام النذر'' قیمت بقیمت بطور تبادلہ لگا دی جائے، جدھر زیادت ہو وہ بحساب ۱/۲ (پچاس فیصدی) نقد لگا دی جائے۔ انشاء اللہ ''نصرت الحدیث'' ہمارے یہاں سے نکلے گی۔

اُس رسالہ ''عزاداری'' کو میں نے بالاستیعاب دیکھا، موضوع تو اس کا کچھ بھی علمی نہیں ہے، مگر آپ کے جوابی مباحث نے اس کو اچھی خاصی علمی تصنیف بنا دیا ہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے ابتدائی حصہ میں ''جوابیت'' بہت زیادہ ہے، کیونکہ آپ نے اس کی ہر بات کا جواب دینے کی کوشش فرمائی ہے۔ فی الحقیقت جوابی نقطہ نظر سے تو اس کی ہی ضرورت تھی، ورنہ موازنہ کرنے والے شاید جواب کو نامکمل سمجھتے، لیکن اس تکمیلِ جواب کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صرف وہی لوگ اس کو دلچسپی سے پڑھیں گے اور اس کی قدر کریں گے جنھوں نے وہ اصل شیعی رسالہ دیکھا ہوگا اور وہ اس کے جواب کے منتظر ہوں گے، یا جن کو ان مباحث سے غیر معمولی دلچسپی ہوگی، باقی عام لوگ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکیں گے، کیونکہ شروع کتاب میں دور تک وہ ''جوابیت'' زیادہ ہے۔ اسی خیال سے ''الفرقان'' میں بھی پوری کتاب کی اشاعت کچھ زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ اس کا آخری حصہ (مجموعہ فتاویٰ) بہترین اور مفید ترین چیز ہے، اور اس میں وہ جوابیت بھی نہیں ہے، بلکہ ایک استقلالی شان ہے، میری رائے بلکہ درخواست ہے کہ وہ پوری کتاب کے ساتھ بھی چاہے شائع ہو، لیکن اس کو الگ بھی ایک مستقل رسالہ کی صورت میں شائع کیا جائے، اس سے آپ کی محنت بہت زیادہ وصول ہو جائے گی اور وہ لوگ بھی اس کو دیکھ سکیں گے جن کو وہ دیکھنا چاہیئے، تو اگر یہ درخواست منظور ہو تو اس کے لئے ایک مستقل چھوٹی سی تمہید بھی تحریر فرما دیجئے، یا میں خود تمہیدی نوٹ لکھ دوں گا اور اس کو ایک مستقل رسالہ کی صورت میں ''الفرقان'' میں اور علیٰحدہ کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا جائے گا۔ اور تمہیدی نوٹ میں یہ واضح کر دیا جائے گا کہ یہ اس رسالہ کا ایک باب ہے جو فلاں شیعی رسالہ کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اس کا جواب مجھے جلدی عنایت فرما دیا جائے تا کہ بصورت منظوری میں حتی الوسع زیر ترتیب بلکہ زیر طبع رسالہ ہی میں اس کو شائع کرنے کی کوشش کر سکوں۔

اگر اس مجموعۂ فتاویٰ میں کوئی اضافہ مناسب سمجھا جائے تو وہ فرما دیا جائے، یا اگر رسالہ کا کوئی

اور جز اس کے ساتھ شامل کرنا مناسب معلوم ہو تو اس کی ہدایت فرمادی جائے۔ میرے خیال میں بعض علماء اہل سنت کی چند عبارتیں ان فتاوے سے پہلے رسالہ میں جو ایک جگہ آ گئی ہیں ان کو بھی ایک چھوٹی سی تمہید اور ایک مستقل عنوان کے اضافہ کے بعد ان فتاویٰ کے ساتھ جوڑا جاسکتا ہے۔

''سماع زہری عن عروہ'' کی تحقیق انیق سے بڑی مسرت ہوئی، اگر تہذیب کا نسخہ مجھے مل بھی جاتا تو میں کہاں اس الجھن کو سمجھ سکتا، اب انشاء اللہ یہ نوٹ جناب ہی کے حوالہ سے درج الفرقان ہوگا،

والسلام- خادم محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ- ۲۹/۴/۴۲ء

....

لکھنؤ - ۲۸/دسمبر ۵۳

حضرت مخدومی! دامت فیوضکم - سلام مسنون

اب تو اللہ تعالی نے خوب لمبی چھٹی کرادی۔ میرا کام امید ہے کہ شروع ہو چکا ہوگا، کتاب کی قریباً دو سو صفحے کی کتابت ہو چکی ہے، صرف ۵۰-۶۰ صفحے باقی ہیں، انشاء اللہ دو ہفتے سے پہلے ہی یہ کام ختم ہو جائے گا، اور امید ہے کہ اس وقت تک مقدمہ بھی تیار ہو جائے گا۔

ہم لوگوں نے ایک بڑی جماعت کے ساتھ ایک دورہ کا پروگرام بنایا ہے، یہ دورہ ۱۱/جنوری سے شروع ہوگا، جونپور، بنارس، غازی پور چار، چار، پانچ، پانچ دن قیام کرنے کے بعد چوتھی منزل غازی پور کے بعد مئو کو رکھا ہے۔ پچھلے دنوں مولوی عبدالحی صاحب [1] کا خط آیا تھا جس میں انھوں نے اس اطلاع کے ساتھ کہ یہاں ممبری کا کام ہو رہا ہے مئو جماعت آنے کے لیے لکھا تھا۔ اس لیے دن تاریخ کے تعین کے ساتھ انشاء اللہ عنقریب اُن کو ہمارے یہاں کے مرکز سے اطلاع جائے گی، ممکن ہے کہ خود میں ہی ان کو خط لکھوں۔ اندازہ یہ ہے کہ ۲۲/جنوری جمعہ کو انشاء اللہ ہماری جماعت مئو پہنچے گی۔ اس جماعت میں غالباً ہم دونوں ہوں گے، یعنی میرے علاوہ علی میاں بھی، اور جماعت کا اندازہ ۶۰-۷۰ سے اوپر افراد کا ہے۔ اگر ان دنوں اسمبلی کے اجلاس نہ ہوئے تو انشاء اللہ زیارت ہوگی۔ والسلام۔

محمد منظور نعمانی

---

(۱) مولوی عبدالحی صاحب سے مراد احقر مرتب کے دادا مرحوم - متوفی ۱۵/جون ۱۹۸۲ء - ہیں، جو حضرت علامہ اعظمیؒ کے ابتدائی تلامذہ اور مولانا نعمانیؒ کے ہم عصروں میں تھے۔

لکھنؤ ۱۸؍ربیع الاول ۱۳۷۶ھ

حضرت مخدومی محترمی! دامت فیوضکم۔ سلام مسنون

گرامی نامہ نے مشرف فرمایا۔ میں نے چاہا تھا کہ قیام کے بارے میں کوئی قابل اطمینان صورت معلوم ہوجائے تو عریضہ لکھوں، اس لیے دو دن کی تاخیر بھی کی، لیکن کوئی صورت سمجھ میں نہیں آئی۔

اتوار کے دن درس کے سلسلہ میں شہر کے اپنے اکثر احباب جمع ہوجاتے ہیں شاید اُن سے مشورہ کرنے سے کوئی صورت اچھی نکل آئے۔

بے تکلف عرض ہے کہ بلّو چپورہ کی مسجد میں جو حجرہ میرے پاس ہے قیام کے لیے وہ اچھا خاصا ہے، لیکن بیت الخلاء کی مستقل تکلیف ہے، کیونکہ مسجد کے ساتھ نہیں ہے، اور چونکہ گھر میں کوئی پکانے والی ملازمہ نہیں ہے اور اہلیہ بھی مستقل مریض بلکہ نیم زندہ نیم مردہ قسم کی ہے، اس لیے میں نے کھانے کے متعلق یہ اصول مقرر کرلیا ہے کہ جو آسانی سے پک جائے اور جس کے لیے مسالہ زیادہ پیسنا نہ پڑے اس وجہ سے دال اور ترکاریاں زیادہ استعمال ہوتی ہیں اور آج کل سرما میں دو تین دن کے لیے ہانڈی میں ایک ہی دن پک جاتی ہے۔ اور دوپہر کو اکثر کھچڑی سے کام چلالیا جاتا ہے۔ ہاں چائے الحمدللہ اچھی سلیقہ کی ملتی ہے اور میرے طعامی ضروریات میں اس کو اولیت حاصل ہے (عتیق حفیظ کا کھانا الگ ہے)

اگر یہ صورت حال نہ رہتی تو میں خود اپنے فائدہ کے لیے اصرار سے عرض کرتا کہ اس حجرہ میں قیام فرمالیا جائے۔ لیکن اب کیسے عرض کروں اور میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا کہ آپ کے قیام کے لیے کوئی جگہ اپنی آبادی کی طرف مل بھی گئی تو کھانے کا اچھا انتظام ہوسکے گا۔ بازار سے اگر اچھا لیا جائے تو بے حد گراں پڑے گا۔ بہر حال کوشش تو اس کے لیے بھی کرنی ہے۔

۱۳۶۸ھ کے ابتدائی تین پرچوں کے لیے عتیق سے کہوں گا، لیکن غالب گمان قریب بہ یقین یہ ہے کہ شاید دفتر میں بالکل نہ ہوں گے۔ ۶۸ھ کے ابتدائی مہینوں میں ایک اپیل پر خریداروں کی تعداد میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا تھا، جس کی وجہ سے ہر مہینہ کا پرچہ اگلے ہی مہینے ختم ہوجاتا تھا۔ اس کے باوجود تلاش کراؤں گا اور اگر مل سکے تو ضرور انشاء اللہ حاضر خدمت ہوں گے۔

''ہندوستان پر تالیفات علوم حدیث'' یہ کوئی مقالہ ہے یا مستقل کتاب ہے؟

میں ایک خاص تکلیف دینے کا ارادہ کررہا ہوں، لیکن یہ سوچ رہا تھا کہ تشریف آوری معلوم

ہوتو حاضر ہوکرزبانی عرض کروں گا۔

الفرقان میں ''معارف الحدیث'' کا جوسلسلہ ہے وہ دراصل اب سے ۱۱-۱۲ برس پہلے شروع کیا تھا، ۳-۴ برس کتاب الایمان کے سلسلہ کی حدیثوں کا سلسلہ جاری رہا، اس زمانہ میں معمول یہ تھا کہ جوشروح اپنے پاس ہیں وہ سب بالاستیعاب دیکھتا تھااور جو کچھ............ [(۱)]منتقل کرنا مناسب سمجھتا تھا وہ سب لے لیتا تھا۔ پھر کئی برس درمیان میں انقطاع رہا، اُس کے بعد اب سے ۲ برس پہلے پھر اس کو شروع کیا اور قریب...... برس میں مابعد الموت (برزخ، قیامت، آخرت، جنت دوزخ) کی حدیثیں ......لیکن طرز اور معیار بہت کچھ بدل دیا، گویا اب مظاہر حق کا مقصد و معیار پیش نظر ہے۔ اب آج کل احادیث رقاق کا سلسلہ جاری ہے۔

جب یہ سلسلہ شروع کیا تھا تو ایک مستقل کتاب کی تیاری ہی پیش نظر تھی۔ کتاب الایمان میں تو صحیحین کی بعض ایسی احادیث بھی لیں جو مشکوٰۃ میں نہیں ہیں، لیکن پھر اپنے کو صرف مشکوٰۃ ہی کا پابند کردیا، گویا متن مشکوٰۃ کا ایک انتخاب ہے۔ جن چیزوں کی رعایت رکھی ہے وہ انشاءاللہ کبھی مشافہۃً عرض کروں گا۔

آخرت کی احادیث کو میں نے کتاب الایمان کے ساتھ جوڑنے کا بلکہ اس کا جز بنانے کا ارادہ کیا تھا۔

اب اتنا ہوگیا ہے کہ پہلی جلد کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ کرلیا ہے، نظر ثانی اور ترمیمات و اضافات کے بعد کتابت کرا رہا ہوں۔ اس جلد میں صرف کتاب الایمان اور بعد الموت کے سلسلہ کی قریباً ڈیڑھ سو حدیثیں ہوں گی، الفرقان سائز کے ۳ سو صفحہ کے قریب ضخامت کا اندازہ ہے۔ فتنہ انکار حدیث کے پیش نظر چاہتا ہوں کہ شروع میں حدیث کی اہمیت اور اس کے مقام پر ایک مقدمہ ہو، اس کے لیے میں تکلیف دینا چاہتا ہوں، میں نے اس مقدمہ کے لیے صرف ۴۰ صفحے سوچے ہیں۔ جب لکھنؤ تشریف آوری ہوگی تو انشاءاللہ مزید تفصیل سے عرض کروں گا، بلکہ اس وقت تک شاید کتاب کی کچھ کاپیاں......بھی ملاحظہ کے لیے پیش کرسکوں گا۔ والسلام۔

خادم محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

(۱) جس کاغذ پر یہ خط تحریر ہے، اس کو کئی جگہ سے کیڑے نے چاٹ ڈالا ہے، ایسی جگہوں پر نقطے دے دیے گئے ہیں (مرتب)

لکھنؤ ۲۹؍ربیع الآخر ۷۳ھ

حضرت مخدومی! دامت فیوضکم سلام مسنون

خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو۔

دیوبند سے صاحبزادہ سید محمد ازہر شاہ کا خط آیا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ میں نے مولانا کو مئو کے پتہ پر خط لکھا ہے تو بھی مولانا سے اس بارہ میں کچھ عرض کر، میں ان کو لکھ رہا ہوں کہ آج کل میں نے ایک تکلیف دے رکھی ہے تاہم عرض کروں گا۔ اگر چہ میرے عرض کرنے کی کوئی ضرورت تو نہیں، لیکن انھوں نے لکھا ہے اس لیے عرض کرتا ہوں۔ علم حدیث میں حضرت شاہ صاحبؒ کے امتیاز اور خاص مقام پر کوئی مقالہ غالبًا ابھی لکھا نہیں گیا ہے، میرا خیال ہے کہ اُس کتاب میں یہ ضرور ہونا چاہئے اور اس کے لیے میری نظر کسی اور پر نہیں جاتی اور میرا خیال ہے کہ یہ کام ایسا ہوگا جو لکھنؤ کے قیام میں بھی ہو سکے گا، اس کے واسطے اپنا ہی کتب خانہ...... ہونا شاید ضروری نہ ہو۔

امید ہے کہ میرا کام کسی حد تک ہو بھی چکا ہوگا اور ہو رہا ہوگا۔

ہم لوگوں کے دورے کا پورا نظام بن گیا ہے، ہمارا قافلہ انشاء اللہ ۲۲؍جنوری والا جمعہ مئو پہنچ کر پڑھے گا۔ غالبًا یہ ناچیز اور مولانا علی میاں دونوں ساتھ ہوں گے۔ مولوی عبدالحی صاحب کبھی کبھی اس کام یعنی تبلیغی کام کے سلسلہ میں خط لکھا کرتے ہیں، اس لیے ان کو میں نے اطلاع دی ہے۔ ایک خط مولانا محمد ایوب صاحب کی خدمت میں بھی لکھا ہے۔

بے تکلف خادم کی حیثیت سے ایک نئی قسم کی گزارش بھی کرتا ہوں، مرچ کا اچار جیسا حضرت والد ماجد مرحوم بنایا کرتے تھے، اگر ویسا ہی اب بھی بنتا ہو (اور غالبًا اس کا موسم یہی ہوتا ہے) تو قریب ایک سیر کے لیے میرے واسطے گھر میں فرما دیا جائے، میں خود پہنچ کر لے لوں گا۔ ہم نے بنانا چاہا، لیکن کبھی ویسا نہیں بن سکا، مولانا مرحوم جو کھلایا کرتے تھے وہ عجیب چیز ہوتی تھی۔ والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

....

باسمہ سبحانہ

از بنارس ۱۸؍جنوری ۵۴ء

حضرت مخدومی! دامت فیوضکم، سلام مسنون، خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو۔

ہم لوگ جماعت کی صورت میں ۱۱؍جنوری کولکھنؤ سے روانہ ہوئے تھے، ۵ دن جونپور قیام رہا اور ۳ دن سے یہاں بنارس مقیم ہیں۔ جماعت کا بڑا حصہ کل انشاء اللہ یہاں سے غازی پور منتقل ہو جائے گا اور باقی حصہ اور ہم دونوں انشاء اللہ پرسوں غازی پور پہنچیں گے، اور ۲۲؍جنوری جمعہ کے دن صبح کی کسی ٹرین سے غازی پور سے انشاءاللہ مئو روانہ ہو کر خدا نے چاہا تو جمعہ مئو ہی میں پڑھیں گے۔ یقین کے قریب امید ہے کہ وہ ''مقدمہ'' انشاءاللہ تیار ملے گا۔ اصل کتاب قریباً ڈھائی سو صفحے کی کتابت اب ختم ہوگئی ہوگی، کچھ پروف کی تصحیح خود کر آیا تھا اور باقی میرے پیچھے عتیق کر رہے ہوں گے اب صرف مقدمہ ہی باقی ہے۔ والسلام

محمد منظور نعمانی

....

باسمہ سبحانہ

لکھنؤ ۲۲؍جنوری ۵۴ء

حضرت مخدومی! دامت فیوضکم سلام مسنون۔ خدا کرے مزاج بعافیت ہو۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت مجھے اچانک بنارس سے لکھنؤ آنا پڑا، تفصیل مولانا علی میاں نے عرض کر دی ہوگی۔ موصوف سے کہہ آیا تھا کہ جمعہ ہی کو انشاء اللہ میں بھی مئو پہنچ جاؤں گا، لیکن اس وقت یہاں کی صورت حال یہ ہے کہ چھوٹے سب بچے مریض ہیں، آج چھٹا دن ہے، گھر میں ولادت ہوئی ہے، جس کی وجہ سے وہ صاحب فراش ہیں اور بچوں کی فکر اور خبر گیری نہیں کر سکتیں۔ یہ صورت حال تو تھی ہی پھر آج رات خود اُن کو لرزہ بخار ہو گیا اور نومولود نہ معلوم کمزوری و شدت سردی کی وجہ سے یا کسی مرض کے حملہ کی وجہ سے بے چارہ ایسی حالت میں ہے کہ کل رات کئی دفعہ دیکھنا پڑا کہ تنفس ہے یا نہیں۔ ان حالات کی وجہ سے مجھے یہاں رکنا ضروری ہو گیا اور اب ان دنوں میں میں مئو حاضر نہ ہو سکوں گا، جس کا بڑا قلق ہے۔ مولانا علی میاں کو بھی خط لکھ رہا ہوں کہ غالباً میں مئو نہ پہنچ سکوں گا، لیکن دوشنبہ کے دن انشاءاللہ گورکھپور پہنچ جاؤں گا، اگر زیادہ مدت اور پورے سفر کے لیے جانے کے حالات نہ ہوئے جب بھی انشاءاللہ گورکھپور ضرور جاؤں گا۔

حضرت سے اس وقت یہ عرض کرنا ہے کہ وہ مقدمہ انشاء اللہ تیار ہوگیا ہوگا وہ علی میاں کو مرحمت فرما دیا جائے۔ اور اس سے بھی بہتر یہ ہوگا کہ دفتر الفرقان کے پتہ پر اس کو رجسٹرڈ روانہ فرما دیا جائے۔

اسی ہفتہ مولوی عبدالباری صاحب کا مبارک پور سے خط آیا ہے، وہ مدرسہ کی ضرورت سے مجھے مارچ میں بلا رہے ہیں جس ضرورت کے لیے وہ بلا رہے ہیں وہ گویا میری ہی پیدا کردہ ہے اس لیے میں انشاء اللہ جاؤں گا اور اُس موقع پر خدا نے چاہا تو مئو بھی حاضر ہوں گا اور اِس وقت حاضر نہ ہو سکنے کی تلافی اس کو سمجھوں گا اور اگر مرچ کا اچار تیار ہوا ہوگا تو اُسی وقت اُس کو بھی لوں گا۔

اِس وقت کے مئو حاضر نہ ہو سکنے کا بچند وجوہ بڑا قلق ہے، دعا کا محتاج اور خواستگار ہوں۔ والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

....

باسمہ سبحانہ وتعالی

لکھنؤ ۷؍جنوری ۵۶ء

حضرت مخدومی! دامت فیوضکم سلام مسنون۔ آج ۳-۴ دن ہوئے دارالمبلغین کے ایک اعظمی طالب علم کسی کام سے آئے تھے، اُن سے میں نے جناب کے متعلق دریافت کیا کہ تشریف لائے ہیں یا نہیں؟ تو انھوں نے بتلایا کہ نہیں تشریف لائے ہیں کچھ طبیعت ناساز ہے، لیکن میں نے اُس سے کوئی اہمیت نہیں محسوس کی، اب کل الجمعیۃ میں بھی ناسازی طبع کی اطلاع پڑھی اور دعا کی استدعا کے ساتھ، اس سے اندازہ ہوا کہ خدانا خواستہ طبیعت کچھ زیادہ ناساز ہے۔ خدا کرے اب حالت بہتر ہو۔ مولانا عبدالجبار صاحب سے فرما دیا جائے کہ وہ دو سطریں مجھے لکھ دیں۔ والسلام

محمد منظور نعمانی عفاء اللہ عنہ